1300 روپے

مریم رابعہ ۔ پھول نگر

رابعہ دو دن بعد کالج گئی تھی۔ پہلے دن سردی اور دھند کی وجہ سے اور دوسرے دن بارش کی وجہ سے نہ جا سکی تھی۔ تیسرے دن کالج گئی تو پتا چلا کہ کل داخلے کی آخری تاریخ ہے۔ ساتھ میں تمام ضروری کاغذات بھی جمع کرانے تھے۔ کالج سے گھر جاتے ہی اس نے سب چیزیں جمع کیں تو پتا چلا کہ رزلٹ کارڈ کی فوٹو کاپی نہیں ہے۔ اس نے بابا سے بات کی تو وہ بولے: ''اتنی صبح فوٹو کاپی والی شاپس نہیں کھلتیں، تم فکر مت کرو، میں کاپی کروا کر کالج دے آؤں گا۔''

اس کے پاپا بہت اچھے تھے۔ پہلے اسے کالج چھوڑ کر آئے، پھر رزلٹ کارڈ کی فوٹو کاپی کروانے گئے تو پتا چلا کہ لائٹ نہیں ہے، ایک گھنٹے بعد آئے گی، لیکن گی اگر ضروری کاپی ہے تو جنریٹر چلا کر دس روپے میں ہو گی۔ انہوں نے دس روپے میں فوٹو کاپی کروائی اور کالج پہنچا دی۔

دوپہر کو جب رابعہ گھر آئی تو پریشان تھی۔ پاپا نے اسے دیکھ کر پوچھا: ''کیوں بھئی! داخلہ ہو گیا؟''

جواب میں وہ چپ رہی تو پاپا نے کہا: ''کیا بات ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''پاپا! میرے بیگ سے کسی نے فیس کے تیرہ سو روپے نکال لیے ہیں۔'' یہ کہہ کر رابعہ رونے لگی۔

''کالج کی لڑکیاں بھی چوری کرتی ہیں!'' اس کی ماما نے غصے سے کہا۔

''بیٹا! چھوٹتی ہوئی گاڑی اور گم ہوئے مال کا افسوس تو نہیں کرنا چاہیے، مگر افسوس اس لڑکی پر ہے جس کی بری حرکت نے ساری کلاس کو شرمندہ کرا دیا۔'' پاپا نے رابعہ کو سمجھایا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تیرہ سو روپے سے کیا وہ محل خرید لے گی۔'' رابعہ نے کہا۔

''بیٹا! وہ جب بھی اپنے ضمیر کا آئینہ دیکھے گی تو اسے اس چورنی کا چہرہ نظر آئے گا جس پر وہ شرم سے پانی پانی ہو جائے گی۔'' اس کے پاپا نے کہا۔

''کیا تم نے مس کو بتایا تھا اور کیا انہوں نے سب کی تلاشی لی تھی؟'' ماما نے پوچھا۔

''جی ماما! مس کی اجازت سے ہم نے سب کے بیگ، جیومیٹری باکس اور پاکٹس وغیرہ دیکھیں، مگر تیرہ سو کہیں نہ مل سکے۔''

رابعہ نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس میں تمہاری بے پروائی کا زیادہ ہاتھ ہے۔ تم نے پیسے سنبھال کر کیوں نہ رکھے؟'' ماما نے غصے سے کہا۔

''چھوڑو بھئی! سب دعا کرو اللہ تعالیٰ آئندہ ایسے واقعے سے محفوظ رکھے۔ ایسی آزمائشیں آتی جاتی رہتی ہیں۔'' پاپا نے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس کا سویا ہوا ضمیر جاگ جائے اور وہ اپنی غلطی تسلیم کر کے روپے واپس کر دے۔'' رابعہ کی چھوٹی بہن آمنہ نے کہا تو اس کا بھائی ابوبکر بھی جلدی سے بولا: ''باجی! جو ہو گیا اسے بھول جائیں اور پاپا سے پیسے لے کر جلدی سے فیس جمع کرائیں، ویسے بھی آخری تاریخ ہے۔ جو ہو گیا، اسے بھول جائیں اور گزرے واقعے پر ماتم کرنے کے بجائے آگے کی فکر کریں۔''

''ہاں بھئی، یہ ٹھیک ہے۔'' پاپا نے کہا اور رابعہ کو ساتھ لے کر چلے گئے۔n

آدھے معاوضے پر

مرزا ظفر بیگ

غلام قادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پی سی او میں داخل ہوا اور وہاں بیٹھے شخص سے کہا: ”مجھے ایک فون کرنا ہے۔“

دکان دار نے فون کا ریسیور اٹھا کر غلام قادر سے کہا: ”نمبر بتاؤ۔“

غلام قادر نے نمبر بتایا تو دکان دار کی انگلیاں ڈائل پر حرکت کرنے لگیں۔ کچھ دیر میں نمبر مل گیا تو دکان دار نے ریسیور غلام قادر کی طرف بڑھا دیا۔

غلام قادر نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لیا اور سنجیدہ لہجے میں بولا: ”کیا میڈم جیلانی سے بات ہو سکتی ہے؟“

”جی میں میڈم جیلانی ہی بات کر رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے ایک عورت کی شفقت بھری آواز سنائی دی:

”بیٹا! تم کون ہو؟“

”میڈم! میں لان کی صفائی کا کام کرتا ہوں۔“ پی سی او پر کھڑے غلام قادر نے کہا: ”میں آپ کے گھر کے لان کی صفائی......“

مگر لڑکے کی پوری بات سننے سے پہلے ہی دوسری طرف سے میڈم جیلانی نے بڑے پیار سے کہا: ”مگر بیٹا! میرے پاس تو لان کی صفائی کرنے والا لڑکا موجود ہے۔“

”میڈم! آپ اس لڑکے کو جو معاوضہ دے رہی ہیں، میں اس سے آدھے معاوضے پر آپ کے لان کی صفائی کر دوں گا، مجھے اس وقت ملازمت کی سخت ضرورت ہے۔“

”مگر بیٹا! میں اس لڑکے کے کام سے مطمئن ہوں، وہ اچھا لڑکا ہے، محنت سے کام کرتا ہے۔ میں آدھے معاوضے کے لالچ میں اس بچے کو اس کی ملازمت سے محروم نہیں کروں گی۔ تم کہیں اور کوشش کر لو، میں بھی تمہارے لیے کوشش کروں گی۔“

میڈم جیلانی نے نرمی سے غلام قادر کو سمجھایا اور اس سے کہا کہ کسی وقت آ کر ان سے مل لے۔

”میڈم! میں آپ کے پورے گھر کا کام کاج کروں گا اور....“

غلام قادر نے ایک آخری کوشش کی تو میڈم جیلانی نے دوسری طرف سے اسے جواب دیا: ”بیٹا! تم سوچو کہ اگر میرے گھر میں کام کرنے والے اس لڑکے کی جگہ تم ہوتے اور اسی طرح کوئی اور لڑکا آدھے معاوضے میں کام کرنے کی پیشکش کرتا جسے میں قبول کر لیتی تو تمہارے دل پر کیا گزرتی؟ تم تو اچانک ہی بے روزگار ہو جاتے ناں؟“

یہ سنتے ہی غلام قادر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پی سی او والا بڑی حیرت سے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا جو اپنے طور پر کافی دیر سے کسی میڈم سے بار بار گزارش کر رہا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاں ملازمت دیدے، مگر میڈم نے منع کر دیا تھا۔ پی سی او والے کو اس لڑکے سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ جب وہ لڑکا فون پر میڈم سے بات کر کے فارغ ہوا تو پی سی او والے نے اس سے کہا: ”مجھے تم اچھے لڑکے لگتے ہو، تم ایسا کرو کہ کل سے میری دکان پر آ جاؤ، میں تمہیں ملازمت دینے کو تیار ہوں۔“

”مگر جناب! مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا: ”میں تو پہلے ہی ملازمت کر رہا ہوں۔“

اس کی بات سن کر پی سی او والا حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تو یہ لڑکا کتنی عاجزی اور انکساری سے میڈم سے ملازمت مانگ رہا تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اگر اسے یہ ملازمت نہ ملی تو شاید وہ بھوکا مر جائے گا، لیکن اب.... وہ سوچنے لگا کہ یقینی طور پر یہ لڑکا یا تو پاگل ہے یا پھر اپنی باتوں سے دوسروں کو بے وقوف بناتا ہے

۔

غلام قادر نامی وہ لڑکا بڑے غور سے دکان دار کو دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”جناب! میں انہی میڈم جیلانی کے ہاں کام کرتا ہوں اور ان کے لان کی صفائی کرتا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ میڈم میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں اور مجھے ہٹا کر کسی دوسرے لڑکے کو رکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن پھر میرے ایک اور دوست نے یہ بتایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے، تمہیں خواہ مخواہ میڈم کی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ اب میں کیا کرتا؟ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک ضرورت مند بن کر میڈم کو خود فون کروں اور ان سے ملازمت مانگوں، مگر میڈم بہت اچھی ہیں، انہوں نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنے ہاں کام کرنے والے لڑکے کو نہیں ہٹائیں گی، کیوں کہ وہ اس سے مطمئن اور خوش ہیں۔ n

آفتاب کی سزا

اشفاق قادر سنگی۔ پنڈ سلطانی، اٹک

آفتاب بہت شرارتی لڑکا تھا۔ ہر روز وہ کوئی نہ کوئی نئی شرارت کرتا تھا۔ ویسے وہ آٹھویں کلاس کا بہت ذہین لڑکا تھا ، مگر شرارتی بھی بہت تھا۔ اس کے گھر والے اور اسکول کے تمام استاد اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے، مگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا۔

عموماً ہر شہر میں پاگل تو ہوتے ہی ہیں۔ ایسا ہی ایک پاگل آفتاب کی گلی میں بھی رہتا تھا جسے سب پاگل کہتے تھے۔ ایک روز اسکول سے واپسی پر آفتاب کو وہ پاگل سڑک پر چلتا نظر آیا تو آفتاب کے ذہن میں فوراً ایک شرارت ابھری اور اس نے سڑک کے کنارے پڑے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیے اور ساتھ ہی "پاگل ، پاگل" کی آوازیں بھی لگانی شروع کر دیں۔ اچانک پاگل نے مڑ کر آفتاب کو دیکھا، وہ بہت غصے میں تھا۔ اس نے جھک کر سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھائی اور آفتاب کو مارنے کے لیے دوڑا۔ آفتاب اس سے ڈر کر بھاگا تو سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا کر سڑک پر گرا جس کے جھٹکے سے اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ آس پاس کے لوگوں نے فوراً اسے اسپتال پہنچایا۔ اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ مگر ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کے بعد اس کی جان بچائی۔ اب آفتاب بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔ اس نے شرارتوں سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی ہے، کیوں کہ اس کو اپنی شرارت کی سزا مل چکی تھی۔ ■

مِل کر افطار کریں



بشریٰ ممتاز احمد

علی، عثمان، ارسلان اور نوید چاروں بہت اچھے اور سچے دوست تھے۔ سب کے کام آتے اور کسی کی مدد کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ شاید اسی لئے انہیں اپنی کلاس، اسکول اور محلے کے سب سے اچھے بچے کہا جاتا تھا۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور سب کی مدد کرنا انہیں بہت پسند تھا۔ خاص طور پر ان کی دوستی تو سب سے زیادہ مشہور تھی، اگر کوئی ایک دوست پریشان ہوتا تو سارے مل کر اس کی پریشانی دور کرتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، ان بچوں نے سوچا کہ وہ غریب اور یتیم بچوں کی مدد کریں گے۔ انہوں نے اپنے جیب خرچ کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مگر اتنے روپے جمع نہ ہو پائے کہ وہ بہ آسانی بچوں کے لئے کچھ لے سکیں۔ پھر انہوں نے اپنے والدین، رشتہ داروں اور اسکول کے بچوں سے بھی چندہ جمع کیا۔ اب وہ سب بہت خوش تھے کہ وہ مطلوبہ مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ اب وہ روز مسجد سے واپسی پر مستحق بچوں کے لئے خریداری کرتے۔

انہوں نے قیمتی تحائف اور نقد رقوم بھی بطور عیدی جمع کئے۔ جو وہ بچوں کو عید پر دینا چاہتے تھے۔ مگر فی الحال تو رمضان المبارک کا پورا مہینہ باقی تھا، ان چاروں نے اپنے والدین سے اجازت لی اور رمضان کے پورے مہینے غریب بچوں اور خاندانوں کے لئے افطاری کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، صبح سحری کے بعد چاروں دوست مل کر عبادت کرتے اور پھر عصر کی نماز کے بعد افطاری کے انتظامات میں مصروف ہو جاتے۔ دوسروں کی مدد کرنے اور اپنی خوشیوں میں سب کو شریک کر کے جو خوشی انہیں ملتی تھی اس کا اندازہ ان کے مسکراتے چہروں سے ہوتا تھا۔

پیارے بچو! رمضان المبارک کا مہینہ، ہم سب کو محبت، رواداری، ایثار اور بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس بابرکت مہینے کی نعمتوں سے خود بھی مستفید ہوں اور اپنے آس پاس موجود دوستوں کو بھی اس میں شریک کر لیں۔ وہ کہتے ہیں نا...... خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ ہم سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم رمضان المبارک میں مل جل کر افطار کریں اور عید کی خوشیاں مل کر منائیں اور اگر کوئی ایسا دوست ہو جو رمضان کے پر مسرت موقع پر تنہا ہو تو اسے اپنے ساتھ شریک کرنے میں بالکل نہ ہچکچائیں۔ یہی اس بابرکت مہینے کی شان ہے۔

اب سمجھا ہوں تجھے!

اشفاق قادری سنگی، گاؤں پنڈ سلطانی

گرمیوں کا موسم اپنے عروج پر تھا۔ دن رات سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ رات کو جب لوگ سو رہے ہوتے تو اچانک بجلی چلی جاتی جس کے بعد فوراً ہی مچھر لوگوں کو کاٹنے چلے آتے۔ ہر شخص خصوصاً بچے بہت پریشان تھے۔ علی دسویں کلاس میں پڑھتا تھا اور بہت ذہین لڑکا تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ تھا، مگر ان دنوں وہ مچھروں کی یلغار سے بہت پریشان رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کی پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ چڑچڑا ہو گیا تھا اور ہر وقت مچھروں کے کاٹنے کی شکایت کرتا رہتا۔

ایک رات علی اپنے ابو، امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ صحن میں چارپائیوں پر سو رہا تھا تو ایک دم بجلی چلی گئی جس کے ساتھ ہی مچھروں نے کاٹنا شروع کر دیا۔ علی کی آنکھ مچھروں کے کاٹنے کی وجہ سے کھل گئی اور اس نے اونچی آواز میں مچھروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سن کر اس کے ابو، امی اور بہن بھائی بھی جاگ گئے۔

علی کے ابو بولے: ”علی بیٹا، کیا بات ہے؟“

علی نے جواب دیا: ”میں مچھروں سے بہت تنگ ہوں۔ اگر میرے بس میں ہو تا تو میں ان سب کو آگ لگا کر زندہ جلا ڈالتا۔“

علی کے ابو نے یہ سن کر کہا: ”کسی کو آگ میں جلانا بہت بری بات ہے اور اللہ تعالیٰ اس طرح کی باتوں سے بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس کی مخلوق کو زندہ آگ میں جلایا جائے۔“

علی نے فوراً توبہ کی اور جلدی سے بولا: ”نہ جانے اللہ پاک نے یہ مچھر کیوں پیدا کیے ہیں؟“

علی کے ابو نے جواب میں کہا: ”دیکھو بیٹا، ہر ایک کام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے اور اللہ پاک نے بغیر کسی حکمت کے کوئی بھی چیز پیدا نہیں فرمائی۔“

”لیکن ابو، مچھر جیسی مخلوق کو پیدا کرنے کیا فائدہ یا کونسی حکمت ہے؟“

علی کے ابو نے جواب دیا: ”بیٹا! مچھر ہم سے خون کی زکوۃ لیتے ہیں۔ یہ ہمیں کاٹ کاٹ کر ہمارا تھوڑا تھوڑا خون چوس لیتے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں خدانخواستہ ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور ہمارا زیادہ خون بہہ جائے تو ہم کیا کریں گے؟ اس طرح ہم مچھر کے کاٹنے اور تھوڑا سا خون نکل جانے سے کسی بھی بڑی مصیبت سے بچ جاتے ہیں۔“

علی نے کہا: ”مگر ابا جان! مچھر کے کاٹنے سے ہمیں ملیریا کی بیماری لگ جاتی ہے۔ پھر ڈینگی مچھر کے کاٹنے سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔“

ابو نے کہا: ”بے شک، لیکن اللہ پاک نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور ہم اپنی عقل کو استعمال کر کے اس مصیبت سے نجات پا سکتے ہیں۔ اصل میں مچھر گندگی سے پیدا ہوتے اور فالتو جگہوں پر کھڑا ہوا پانی مچھروں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گردوپیش کی صفائی رکھیں اور ہر جگہ پانی کھڑا نہ ہونے دیں، اور اگر کہیں فالتو پانی کھڑا ہو تو اس میں دوا ڈال دیں، تاکہ مچھر پیدا نہ ہوں۔“

علی نے ابو سے سوال کیا: ”لیکن ابو! اگر مچھر ہمیں کاٹ لے تو اس کا علاج کیا ہے؟“

ابو بولے: ”بیٹا! ان دنوں یعنی گرمیوں میں ہمیں لیموں کا زیادہ استعمال کرنا چاہیے، ایک تو لیموں ہماری پیاس بجھاتے ہیں اور دوسرے اس سے ہمیں ملیریا سے تحفظ ملتا ہے۔“

علی یہ سب باتیں سن کر بہت خوش ہوا اور بولا: ”ابو جان! کچھ اور بتائیے ناں!“

ابو نے کہا: ”تم نے اپنے دن بھر کے پہنے ہوئے جوتے اور جرابیں اپنی چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی ہیں جس کی بدبو کی وجہ سے مچھر تم پر حملہ کرتے ہیں۔ انہیں یہاں سے ہٹا دو۔“

علی نے ابو کی ہدایت پر عمل کیا۔ ابو بولے: ”کل ہم لوگ بازار سے مچھر دانیاں لائیں گے اور سوتے وقت ان کا استعمال کریں گے تاکہ مچھروں سے بچ سکیں۔“

اگلے دن اتوار تھا۔ علی نے ابو کے ساتھ مل کر تمام محلے والوں کو جمع کیا اور سب نے مل کر اپنے محلّہ کی صفائی کی۔ انہوں نے جگہ جگہ کھڑا پانی صاف کیا۔ پھر بازار سے مچھر دانیاں خرید لائے۔ اس رات بھی بجلی گئی، لیکن وہ مچھروں کے کاٹنے سے محفوظ رہے اور مزے سے سوئے۔ n

اب ضد نہیں کروں گا

عنایت اللہ شاکر وہوا

فرحان اپنے ماں باپ کا ایسا بیٹا تھا جسے ان کے بے جا لاڈ پیار نے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ وہ جو چیز پسند کرتا، اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتا۔ ماں باپ نے اسے بہت سمجھاتے تھے، مگر فرحان ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ وقت اپنی چال سے چلتا رہا اور فرحان بڑا ہو گیا، مگر اس کی عادت نہ بدلی، بلکہ اس کی فضول سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ گرمیوں کی دوپہر میں سارا دن کھیتوں اور باغوں میں گھومتا رہتا۔ کبھی کسی درخت سے آم توڑ کر کھاتا تو کبھی پھول پودے تباہ کر دیتا اور کبھی سوئے ہوئے لوگوں کی نیند خراب کر دیتا۔ اگر لوگ اس کے والدین سے شکایت کرتے تو ان کی اور بھی شامت آجاتی، اس لیے لوگوں نے اس کی شکایت کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔

گرمیوں کی ایک دوپہر کو فرحان ایک کھیت میں پہنچا تو اس نے ساتھ والے باغ میں ایک عجیب و غریب درخت اگا دیکھا جس پر بڑے عجیب اور بڑے بڑے آم لگے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر فرحان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ درخت کی طرف بڑھا۔ جونہی اس نے ایک آم توڑنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آم اس کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ پھر ایک اور عجیب بات ہوئی، آم کے اونچا ہوتے ہی فرحان کا قد بھی بڑھ گیا۔ پھر وہ درخت زمین سے اکھڑا اور ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کے ساتھ فرحان بھی ہوا میں اڑنے لگا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک ہوا میں اڑتا رہا اور پھر ایک اجنبی جگہ پر اترا تو درخت غائب تھا۔ فرحان نے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ اس کے چاروں طرف کالے پہاڑ، کالے درخت، کالی مٹی چھوٹی چھوٹی کالی عمارتیں اور درختوں پر کالے پھل لگے تھے، یعنی وہاں کی ہر چیز کالی تھی۔

اچانک اسے ایک طرف سے بہت سے کالے کالے موٹے آدمی آتے دکھائی دیے جن کے سروں پر بڑے بڑے سینگ بھی تھے۔ انہوں نے فرحان کو پکڑا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ ایک بازار سے گزرے جہاں بکنے والی ہر چیز کالی تھی۔ بازار کا ہر شخص حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد وہ لوگ ایک محل میں پہنچے۔ محل کے بڑے ہال میں کالے تخت پر ایک ڈراؤنی شکل کا آدمی بیٹھا تھا۔ فرحان کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

اس آدمی کی خوف ناک آواز ہال میں گونجی: ”لڑکے! میرا نام ضد ہے، تم اب ضدستان میں ہو۔ جو بچہ اپنے والدین اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا، اسے یہاں لاکر سزا دی جاتی ہے۔ یہاں سب کے رنگ اسی لیے کالے ہیں کہ یہ ان کی سزا ہے۔ اب تمہیں بھی سزا دی جائے گی۔“

یہ سن کر فرحان کے ہوش اڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد اسے لانے والے کالے آدمی اسے پکڑ کر ایک میدان میں لے گئے جہاں اس کی عمر کے کتنے ہی بچے بیٹھے تھے۔ ان سب کے رنگ کالے اور سروں پر سینگ اگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر فرحان نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی چیخ نکل گئی، اس کے سر پر بھی دو چھوٹے چھوٹے سینگ اگے ہوئے تھے۔ فرحان ان بچوں کے پاس پہنچا تو یہ جان کر اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر فرحان نے کچھ کہنا چاہا تو اس کی اس کی آواز حلق میں ہی رہ گئی، اب وہ بھی گونگا ہو چکا تھا۔

رات کی تنہائی میں اسے ماں باپ یاد آئے تو وہ رونے لگا۔ روتے روتے وہ سو گیا تو خواب میں اسے ایک پری نظر آئی جو کہہ رہی تھی: ”فرحان! تمہیں تمہاری ضد کی سزا مل رہی ہے۔ اب بھی اگر تم یہ وعدہ کرلو کہ آئندہ ضد نہیں کرو گے تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

فرحان نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔ یہ سن کر پری سے وعدہ کیا کہ وہ ضد کرنا چھوڑ دے گا اور آئندہ سے اچھا بچہ بن کر رہے گا۔ اسی وقت وہاں کے کالے سپاہی آگئے اور فرحان کو پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر فرحان چیخنے لگا: ”امی! ابو! مجھے بچائیں....“

اسی وقت فرحان کو اپنی امی کی آواز سنائی دی: ”فرحان بیٹا! کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟“

امی کی آواز سنتے ہی فرحان کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے روتے ہوئے امی سے معافی مانگی اور ان سے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی ضد نہیں کرے گا۔ امی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ وہ کیوں ڈرا ہوا ہے اور معافی کس بات کی مانگ رہا ہے۔ n

احمد کی سالگرہ

شائم عزیز۔ سرگودھا

صبح کا وقت تھا۔ احمد جب سے سو کر اٹھا، وہ بہت دکھی تھا، کیوں کہ آج اس کی سالگرہ تھی اور کسی نے اس کو مبارک باد تک نہیں دی تھی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا، لیکن جب کسی نے بھی اسے سالگرہ کی مبارک باد نہیں دی تو وہ مایوسی کے عالم میں چپ چاپ اٹھا اور بغیر ناشتہ کیے اسکول چلا گیا۔ اسکول میں بھی اسے امید تھی کہ شاید کوئی اسے کو سالگرہ کی مبارک باد دے، مگر وہاں بھی سب خاموش تھے۔ شاید کسی کو اس کی سالگرہ کا دن تک یاد نہیں رہا تھا۔

وہ پورا دن مایوسی کے عالم میں اسکول میں اکیلا ہی بیٹھا رہا اور چھٹی کے وقت خاموشی سے اٹھ کر واپس گھر آ گیا۔

گھر میں اس نے اپنے کمرے میں جاکر کپڑے تبدیل کیے اور کھانا کھائے بغیر باہر کھیلنے چلا جائے گا۔ کھیلتے کھیلتے اسے شام ہو گئی۔ جب شام کو چھے بجے کے قریب وہ گھر آیا تو دروازے میں گھستے ہوئے وہ ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اس نے نیچے جھک کر وہ پتھر اٹھایا تو اس کے نیچے ایک کاغذ پر لکھا تھا: ”آگے جاؤ!“

آگے جانے لگا تو پیچھے سے اسے کسی نے دھکا دیا اور وہ جاکر سیدھا صوفے پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹیں روشن ہوئیں اور کمرہ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ احمد نے بڑی خوشی سے ان سب سے سالگرہ کی مبارک باد وصول کی۔ اس کی سالگرہ کا دن کوئی نہیں بھولا تھا، بس سب نے اسے سرپرائز دیا تھا۔ اس نے دوستوں سے تحائف وصول کیے اور سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔n

احساس

سویرا خان۔ سکندری (پشاور)

"حرا! منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ، کھانا تیار ہے۔" امی نے حرا کو آواز دی جو ابھی اسکول سے آئی تھی۔ اس کا آج میٹرک کا آخری پیپر تھا۔ حرا کے ابو کچھ دن پہلے کاروباری دورے پر ترکی گئے تھے۔ وہ اپنے امی ابو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ویسے تو حرا بہت اچھی لڑکی تھی، مگر اس میں ایک بری عادت بھی تھی۔ وہ خود تو صاف رہتی تھی، مگر اپنے اردگرد کی جگہوں کو صاف نہیں رکھتی تھی۔ اسکول میں جب وہ کچھ کھاتی تو اس کے چھلکے کوڑے دان کے بجائے ایسے ہی پھینک دیتی تھی۔ اسے ٹیچرز سے بھی ڈانٹ پڑتی تھی۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی، اس ایک خامی اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

امی ابو بھی حرا کو سمجھاتے تھے، مگر اس نے ان کی بات پر کبھی کوئی توجہ نہ دی۔

☆☆☆

"کیا ہوا بیٹا! آج بہت پریشان لگ رہی ہو؟" ایک روز امی نے حرا سے پوچھا جو کھانا کھانے کے بجائے پلیٹ میں چمچہ ہلا رہی تھی۔

"امی! کیا پرندے بھی حساس ہوتے ہیں؟" حرا نے امی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں، کھل کر بتاؤ۔" امی نے پوچھا۔

حرا نے کہا: "امی! آج مجھے اسکول میں بھوک لگی تو میں نے اسکول سے باہر والی دکان سے چپس اور ٹافیاں خریدیں اور کھانے لگی، کھانے کے بعد مجھے فٹ پاتھ پر ایک کوڑے دان نظر آیا جس کے ساتھ گندگی بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگوں نے بھی اس کے باہر کوڑا پھینکا ہے تو میں بھی پھینک دیتی ہوں۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اسی وقت ایک کوا آیا، اس نے ایک ایک کر کے سارا کوڑا اپنی چونچ میں دبا کر کوڑے دان میں ڈال دیا۔ اس بات کا احساس تو ہمیں ہونا چاہیے تھا، ہمیں اللہ نے علم دے کر دوسری مخلوقات سے ممتاز کیا ہے اور ہمیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔"

امی نے حرا کی بات سن کر کہا: "تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! علم و عقل کے باعث ہی انسان دوسری مخلوقات سے افضل ہے۔" پھر امی نے صفائی کے متعلق حرا کو کئی احادیث سنائیں جنھیں سن کر حرا نے کہا: "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ صفائی کا خاص خیال رکھوں گی اور دوسروں کو بھی صاف رہنے کی تلقین کروں گی۔"

امی مسکرا کر حرا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں: "شکر ہے بیٹا! تمھیں جلد احساس ہو گیا۔"

حرا نے کہا: "میں اس کوے کا بھی شکریہ ادا کروں گی جس نے مجھے غفلت سے جگایا۔" n

ایک کرسی کی کہانی

رانیہ خالد۔ راولپنڈی

میں ایک کرسی ہوں۔ وہ کرسی جس پر بیٹھ کر آپ مختلف کام کرتے ہیں۔ لوگوں نے مجھے مختلف شکلوں میں ڈھال رکھا ہے، لیکن یہ سچ ہے کہ میں ایک بہت پرانی ایجاد ہوں۔

کسی جنگل میں لکڑہارے نے ایک گھنے درخت کی لکڑی کاٹ کر شہر میں فروخت کر دی۔ وہاں ایک فیکٹری میں اس لکڑی کو مشین میں ڈال کر تراشا گیا اور پھر اس کو ایک کرسی کی شکل دے دی گئی۔ اس کے بعد مجھے مزید خوب صورت بنانے کے لیے مجھ پر مختلف رنگ کیے گئے جس سے میری خوب صورتی کو چار چاند لگ گئے۔ پھر فیکٹری سے کسی گاڑی میں رکھ کر مجھے فرنیچر کی ایک بڑی دکان پر بھجوا دیا گیا۔ میرے ساتھ میرے دوسرے کئی ساتھی اور دوست بھی اس دکان میں تھے۔ وہ سب وہاں فروخت ہونے کے لیے ہی رکھے گئے تھے۔ ایک ایک کر کے میرے سارے دوست فروخت ہو گئے اور میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اب مجھے شدت سے کسی اچھے گاہک کا انتظار تھا جو مجھے میرے نئے گھر لے جائے۔

آخر ایک دن ایک خوش لباس آدمی دکان میں داخل ہوا۔ وہ کسی اسکول کے پرنسپل صاحب تھے جنھیں اپنی نرسری کی کلاس کے لیے کرسیوں کی ضرورت تھی۔ جب ان کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ مجھے اور مجھ جیسی تمام رنگ برنگی کرسیاں لینے کے لیے ایک دم تیار ہو گئے۔ وہ کافی مطمئن لگ رہے تھے، کیوں کہ انہیں نرسری کلاس کے لیے مجھ جیسی کرسیاں چاہیے تھیں۔ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا جب دکان دار نے مجھے ایک بڑی گاڑی میں رکھوا دیا۔ اب میں مزے سے اپنے نئے گھر جا رہی تھی۔ کلاس میں مجھے باقی کرسیوں کے ساتھ ایک قطار میں رکھ دیا گیا۔ اگلے دن ننھے بچے میرے اوپر بیٹھ گئے۔ کلاس میں مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ میں اپنے نئے دوستوں سے باتیں کرتی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی شرارتیں دیکھ کر خوب لطف اندوز ہوتی۔ لیکن کچھ سال بعد میرا رنگ اترنا شروع ہو گیا اور میری لکڑی بھی خراب ہونے لگی جس کے بعد مجھے ایک کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ کباڑیے نے مجھے لے جا کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا جہاں سے گزرنے والے ایک سرکاری ملازم نے مجھے خرید لیا۔ وہاں کچھ سال گزارنے کے بعد مجھے ایک اسٹور میں رکھ دیا گیا۔ اس اسٹور میں میری لکڑی کو دیمک لگ گئی۔ میں بہت اداس تھی، مگر ایک دن اسٹور میں سرکاری ملازم کا بیٹا داخل ہوا اور مجھے پیار سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب اس کے ابو کمرے میں داخل ہوئے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اپنے بیٹے کی فرمائش پر مجھ پر نیا رنگ و روغن کرا دیا۔

اب میں اس رحم دل بچے کے کمرے میں اس کے ساتھ رہتی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ n

آخری امید

آمنہ سعید۔اسلام آباد

شاہل نے آخری امید کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بس یہی دعا مانگی: ”اے اللہ! مجھے اس مقابلے میں کامیابی عطا فرما، تاکہ اس سے ملنے والی انعامی رقم سے میں اپنے ابو کا علاج کروا سکوں۔ اے میرے رب! تو میری مدد فرما! اس مشکل وقت میں سب رشتے داروں نے ہم سے منہ موڑ لیا، لیکن تو تو اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ یا اللہ! مجھے ہر حال میں اس مقابلے میں پہلا نمبر دلوا دے۔ مجھے کامیابی عطا فرما اور میرے ابو کو بھی تن درستی اور صحت عطا فرما۔“ شاہل بڑی عاجزی سے دعا مانگے جا رہی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی امی روزینہ بیگم نہ جانے کب سے کھڑی یہ سب دیکھ اور سن رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے، اتنی چھوٹی سی بچی اور اتنا حساس دل! وہ اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئیں اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

شاہل ساتویں کلاس کی ایک ہونہار طالبہ تھی۔ وہ ایک غریب مگر سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ابو چھوٹی موٹی ملازمت کرتے تھے۔ ایک روز انہیں اچانک دل کا دورہ پڑا تو فیکٹری کے لوگ انہیں سرکاری اسپتال لے گئے۔ لیکن وہاں ضروری آلات نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ایک پرائیویٹ اسپتال بھیج دیا گیا جنھوں نے فوری طور پر دل کے آپریشن کرنے کو کہا جس پر ڈیڑھ لاکھ روپے کا خرچ ہونا تھا۔ یہ سنتے ہی سب رشتے داروں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، جب کہ ڈاکٹر نے چند روز کا وقت دیا تھا۔ شاہل کے ابو کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ شاہل اور اس کی امی نے ہر جاننے والے سے بات کر کے دیکھ لیا، مگر کوئی بھی اتنی بڑی رقم دینے کو تیار نہ تھا۔

لیکن ایک آخری امید ابھی باقی تھی۔ شاہل نے اس خصوصی انٹرنیشنل ریس میں حصہ لینے کے لیے اپنا نام لکھوایا ہوا تھا جس میں جیتنے والے کو دو لاکھ کا انعام ملنا تھا۔ اس ریس میں جیت شاہل کی آخری امید تھی۔ اس مقابلے میں آٹھ ممالک کی طالبات حصہ لے رہی تھیں۔ ایسے میں شاہل کو اپنی جیت ناممکن تو نہیں، مگر مشکل ضرور لگ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے حوصلے کو پست نہ ہونے دیا۔ مقابلے والے دن اسکول جانے سے پہلے شاہل نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی اور پھر مطلوبہ مقام کے لیے روانہ ہو گئی۔

میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاہل اپنے اسکول کی واحد طالبہ تھی جس نے اس ریس میں حصہ لیا تھا۔ تمام ٹیچرز اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔ مقابلے کے شروع ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ شاہل نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد کی دعا کی اور کچھ آیات پڑھ اپنے جسم پر پھونک لیں۔ سیٹی بجتے ہی سب طالبات نے دوڑنا شروع کر دیا۔ شاہل کا سانس شروع میں ہی پھول گیا، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور بھاگتی رہی۔ اتنے میں پیچھے سے اسے زور کا دھکا لگا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اس کے اسکول کے تمام اسٹوڈنٹ اور ٹیچرز اسے اٹھنے کا کہہ رہے تھے اور چیخ چیخ کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ شاہل نے ایک نظر اپنی ساتھیوں کو دیکھا اور ایک نظر اپنے پاؤں سے بہتے خون کو، باقی طالبات اس سے کافی آگے نکل چکی تھیں۔ اس کے سامنے بس ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا اپنے ابو کی زندگی! اس نے بھیگی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک نیا ارادہ، نیا عزم اور نئی ہمت کے ساتھ وہ بھاگی اور سب کو حیران کرتی سب سے آگے نکلتی چلی گئی۔ مطلوبہ مقام پر پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ انتظامیہ کے لوگ اسے اٹھا کر ایک طرف لے گئے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد دی گئی اور اس کے پاؤں کی مرہم پٹی کی گئی۔ حواس بحال ہونے کے بعد شاہل کو اسٹیج پر لایا گیا۔ ہر طرف اس کے لیے شاباشی کے نعرے گونج رہے تھے۔ پورا اسکول اس پر فخر کر رہا تھا کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے اسکول بلکہ پاکستان کا نام بھی روشن کیا تھا۔ شاہل نے فخریہ انداز میں اپنا انعام وصول کیا اور اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ کون سیکنڈ آیا اور کون تھرڈ۔

وہ اپنی امی کے ساتھ سیدھی اسپتال پہنچی اور رقم ادا کی جس کے بعد اس کے ابو کا آپریشن بھی ہو گیا جو کامیاب رہا۔ شاہل ایک دفعہ پھر اللہ کے حضور سجدہ کر رہی تھی کہ اپنی ہمت اور سچی لگن سے اس نے اپنی منزل پا لی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے ابو کی صحت یابی کا باعث بنی بلکہ اس نے پاکستان کا نام بھی روشن کر دیا۔ n

عالیہ کی معافی

ساجد کمبوہ۔ پھول نگر

عالیہ آج نہ چاہتے ہوئے بھی کالج جانے کو تیار ہو رہی تھی، کلاسیں تین چار دن سے ہو رہی تھیں، مگر اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ اس کی ماما نے آج صبح اس سے کہا تھا: ''آج کالج ضرور جانا، پہلے ہی ایک سال ضائع ہو چکا ہے۔'' پھر عالیہ نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا، بیگ اٹھایا اور کالج روانہ ہو گئی۔ اسے چار ماہ پہلے کے وہ دن یاد آ گئے جب داخلہ فیس جمع کرنے کی آخری تاریخ پر ماما نے بڑی مشکل سے اس کی فیس کا انتظام کیا تھا۔ وہ فارم جمع کرانے گئی تو کسی نے اس کی فیس نکال لی۔

اب تو اس کا برا حال ہو گیا، اس نے بہت کوشش کی، کئی سہیلیوں کے ساتھ مل کر دوسری لڑکیوں کے بیگ، جیومیٹری بکس اور کتابیں وغیرہ چیک کیں مگر کچھ نہ ملا۔

اس کی ماما نے کئی ماہ کی بچت سے اس کی فیس جمع کی تھی۔ جب وہ روتی ہوئی گھر آئی تو اس کی ماما نے وجہ پوچھی جس پر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماما دوبارہ فیس نہیں دے سکتیں، ویسے بھی آخری تاریخ تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ ماما سب کچھ بتاتی۔ ماما بے چاری خوش تھیں کہ ان کی بچت کام آ گئی۔

ڈیٹ شیٹ آئی تو عالیہ نے اپنی سہیلی سے لے کر فوٹو کاپی بنوائی اور امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ اسے پڑھتا دیکھ کر اس کی ماما اور گھر والے بہت خوش تھے۔ وہ مقررہ وقت پر کالج آتی اور گراؤنڈ میں ایک بنچ پر بیٹھ جاتی۔ اسے اس لڑکی پر بہت غصہ تھا جس نے اس کے پیسے چرائے تھے۔ بعد میں اور بھی چوریاں ہوئیں چور لڑکیاں پکڑی بھی گئیں مگر اب کیا فائدہ؟ گھر والے پوچھتے کہ پیپر کیسے ہو رہے ہیں تو وہ کہتی: ''کورس سے باہر کے سوال آ رہے ہیں۔'' اس پر ماما پیپر بنانے والوں کو کوستیں۔ بہر حال تمام پیپرز ہو گئے اور مقررہ وقت پر رزلٹ بھی آ گیا۔ اس نے ماما کو بتایا کہ تین مضامین میں تو سپلی آئی ہے اور باقی میں نمبر کم ہیں، مجھے دوبارہ پیپر دینے پڑیں گے۔ ماما نے پہلے تو غصہ کیا، مگر پھر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں۔ رزلٹ والے دن عالیہ اپنی سوچوں میں گم کالج پہنچی اور آنکھوں کی نمی صاف کر کے اندر داخل ہو گئی۔

وہ فرسٹ ایئر کی اپنی کلاس میں گئی جہاں بہت سی نئی لڑکیاں تھیں، ایک دوسرے سے تعارف کا سلسلہ چل رہا تھا۔ کچھ لڑکیاں اس کی پچھلی کلاس کی بھی تھیں جو فیل ہو گئی تھیں، ان میں شبانہ بھی تھی۔ اسے دیکھ کر شبانہ نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مگر وہ اسی کے پاس پہنچی اور کہا: ''ہیلو شبانہ! کیسی ہو؟ مشعل کیسی ہے، سروج کیسی ہے؟'' عالیہ نے ایک ہی سانس میں شبانہ سے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے، مگر تم یہاں کہاں؟'' شبانہ نے الٹا سوال کیا۔

''تمہیں پتا ہے نا کہ کسی نے میری فیس چرا لی تھی، جس کی وجہ سے میں پیپر نہ دے سکی تھی۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

چند لمحوں بعد شبانہ نے کہا: ''میں بھی اسی کلاس میں ہوں، فیل ہو گئی ہوں ناں۔''

''مگر ایسا کیسے ہو گیا؟'' شبانہ نے پوچھا۔

''یہ میرے کیے کی سزا تھی۔ اصل میں، میں نے ہی تمہاری فیس چرائی تھی۔'' شبانہ نے کہا تو عالیہ حیرت سے اچھل پڑی۔ اس کے بعد شبانہ نے رونا شروع کیا تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اسے اس طرح روتا دیکھ کر عالیہ پریشان ہو گئی اور اس سے کہنے لگی: ''جلدی سے اپنے آنسو پونچھو سب لڑکیاں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔''

شبانہ بولی: ''میری اصلاح کرنے والا کوئی نہ تھا، یہ میری بد قسمتی تھی کہ میرے گروپ میں ثمرہ شامل ہو گئی جس سے ہمارا بہت نقصان ہوا اور ہم نے بہت سی بد دعائیں سمیٹیں۔''

عالیہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا: ''شبانہ! میں تمہیں معاف کر چکی ہوں، اب اللہ سے معافی مانگو۔ اب ہم دونوں مل کر محنت کریں گے اور انشاء اللہ پاس بھی ہوں گے۔'' یہ کہہ کر عالیہ نے شبانہ کو اپنے گلے لگا لیا اور دونوں مسکرانے لگیں۔ n

اللہ دیکھ رہا ہے

عبدالکریم۔ لدھیو (گوجرانوالہ)

ابراہیم اور سمیع اللہ میں کافی عرصے سے دوستی تھی، مگر پھر بھی ابراہیم، سمیع اللہ کے ہر کام سے اتفاق نہیں کرتا تھا، کیوں کہ اسے اکثر سمیع اللہ کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نماز عشاء کے بعد ابراہیم کے گھر کے دروازے پر کسی نے دستک دی تو ابراہیم کے ابو نے دروازہ کھولا۔ وہ سمیع اللہ تھا۔ اس نے ابراہیم کے ابو کو سلام کرنے کے بعد ان سے کہا: ”جلدی سے ابراہیم کو بھیج دیں، ہمیں ضروری کام سے جانا ہے۔“

ابراہیم کے ابو نے واپس آکر ابراہیم کو بتایا تو فوراً گھر سے باہر گیا جہاں سمیع اللہ موٹر سائیکل لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ ابراہیم نے سمیع اللہ سے پوچھا تو اس نے کہا:

”سوال جواب کا وقت نہیں ہے، جلدی سے بیٹھو، دیر ہو جائے گی۔“

ابراہیم مزید کوئی سوال کیے بغیر سمیع اللہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل تیزی سے روانہ ہو گئی۔ حالاں کہ وہ ہمیشہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا تھا، مگر آج اپنے دوست سے مزید کچھ پوچھے بغیر وہ جس طرح روانہ ہو گیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے سمیع اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے سمیع اللہ سے پوچھا: ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ساتھ والے گاؤں جانا ہے۔“ سمیع اللہ نے مختصر جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ لوگ ساتھ والے گاؤں پہنچ گئے۔ سمیع اللہ نے موٹر سائیکل گاؤں سے ذرا ہٹ کر روک دی۔ سامنے کچھ فاصلے پر کچے پکے گھر دکھائی دے رہے تھے۔

”میں آتا ہوں، تم یہیں رکو۔“ سمیع اللہ نے ابراہیم سے کہا اور تیزی سے دیوار پھلانگ کر اندر گھر میں چلا گیا۔

ابراہیم حیرت سے کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد سمیع اللہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں بہت سا سامان تھا۔ اس نے ابراہیم سے کہا: ”آج اس گھر کے لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور یہاں........“

”تم نے چوری کی ہے سمیع اللہ؟“ ابراہیم نے اس کی بات کاٹی۔

”مگر ہمیں کسی نے دیکھا تو نہیں ہے ناں!“ سمیع اللہ نے کہنے کی کوشش کی۔

”ایک ذات ایسی ہے جو ہر کسی کو ہر وقت دیکھتی ہے۔ اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔“ ابراہیم نے کہا: ”وہ ہمارا رب ہے جو ہمیں ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ کیا اس سے چھپ سکو گے؟“

سمیع اللہ پر ابراہیم کے الفاظ گویا بجلی بن کر گرے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے دوست کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔

”تمہارا شکریہ میرے دوست! تم نے مجھے اس کام سے روک کر بالکل صحیح وقت پر بچا لیا ورنہ میری زندگی تباہ ہو جاتی۔“

سمیع اللہ نے کہا: ”ہاں واقعی ہمارا اللہ ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے، اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔“

دونوں دوست مسکراتے ہوئے واپس آ گئے۔ n

آم کا درخت اور ببلو

نظر علی برمانی......وادو

پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں ایک غریب لڑکا اپنی نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ نانی کے سوا اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس لڑکے کا نام بہلو تھا۔ بہلو بہت ہی نیک، ایماندار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ بہلو کی نانی اس سے بہت پیار کرتی تھیں، ہمیشہ اچھی باتیں سکھاتیں اور نیک کاموں کی ترغیب دیتی تھیں۔ یہ ان کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ بہلو بچپن سے ہی محنت میں عظمت کے اصول کو اپنائے ہوئے تھا۔ پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں کی بکریاں چرایا کرتا اور دوسروں کی مدد کرنے میں ہمیشہ آگے رہتا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح جب بکریاں چرانے کے لئے نکلتا تو گھر سے اپنے لئے دوپہر کا کھانا لے کر جاتا۔

بہلو کی عادت تھی کہ جب وہ بکریاں چرانے کے دوران دوپہر کا کھانا کھاتا تھا تو بچا ہوا کھانا ایک جگہ گڑھا کھود کر اس میں دبا دیتا۔ خدا کی قدرت کہ جس جگہ بہلو کھانا دباتا تھا اس جگہ ایک آم کا درخت اگنے لگا جو کہ تھوڑے ہی دنوں میں ایک بڑا درخت بن گیا، اس خاص درخت پر ہر وقت بڑے بڑے اور میٹھے آم لگے رہتے تھے۔ یہ دیکھ کر بہلو بہت خوش ہوتا اور اسے جب بھی بھوک لگتی وہ دوڑ کر درخت پر چڑھ جاتا اور مزے سے آم کھاتا۔ ایک دن بکریاں چراتے ہوئے اس کو بھوک لگی تو وہ آم کے درخت پر چڑھ گیا اور مزے سے آم کھانے لگا۔

اچانک وہاں سے ایک جادوگرنی گزری اس جادوگرنی نے بہلو کو اس درخت کے اوپر دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ جادوگرنی سوچنے لگی کہ یہ بچہ یہاں اکیلے اس درخت پر مزے سے آم کھا رہا ہے اور میں بھوکی بیٹھی ہوں، میں بھی یہ آم کھانا چاہتی ہوں مگر روز روز اپنے گھر سے اتنی دور آم توڑنے کیسے آسکتی ہوں۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ میں اس بچے کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور اپنے جادو سے اس کو اپنا فرمانبردار غلام بنالوں۔ اس طرح مجھے مفت میں ایک نوکر بھی مل جائے گا اور آم کھانے کی مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔ مگر اس کو پھنساؤں کیسے؟ تبھی اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ اس آم کے درخت کے نیچے کھڑی ہو کر زور زور سے رونے لگی۔

بہلو نے جب اس کو روتے ہوئے دیکھا تو اس سے رونے کا سبب پوچھنے لگا۔ جادوگرنی روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بیٹا مجھے بہت بھوک لگی ہے میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تم مجھے اس درخت سے کچھ آم توڑ کے دے دو میں تم کو بہت دعائیں دوں گی۔'' بہلو رحمدل تھا، اس کو رحم آ گیا۔

بہلو بولا۔ ''ٹھیک ہے میں یہاں سے آم توڑ کر پھینک رہا ہوں، آپ پکڑ لینا۔'' جادوگرنی نے جب یہ سنا تو کہنے لگی۔ ''نہیں بیٹا میں بوڑھی ہوں مجھے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا، تمہارے پھینکے ہوئے آم میں نہیں پکڑ سکوں گی اور آم زمین پر گر کر خراب ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ آم توڑ کر نیچے آجاؤ اور مجھے اپنے ہاتھ سے دو۔''

بہلو اس کی باتوں میں آگیا، بولا۔ ''ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔'' پھر جب وہ آم لے کر نیچے آیا تو جادوگرنی نے سوچا کہ اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا اور جلدی سے بہلو کو اپنے جادوئی تھیلے میں ڈال کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ جادوگرنی دل میں بہت خوش تھی کہ مفت میں نوکر مل گیا جو نہ صرف اس کی خدمت کرے گا بلکہ اسے روز آم بھی لا کر کھلائے گا۔

چلتے چلتے راستے میں جادوگرنی کو پیاس لگی۔ اسے ایک کنواں نظر آیا اس نے وہ تھیلی جس میں بہلو بند تھا، ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپادی اور کنوئیں پر پانی پینے چلی گئی۔ جادوگرنی کو وہاں تھیلی چھپاتے ہوئے ایک کسان نے دیکھ لیا، جب جادوگرنی پانی پینے چلی گئی تو کسان نے سوچا کہ آخر اس میں ہے کیا، جو وہ بوڑھی عورت اسے یوں چھپا کر گئی ہے۔ جب کسان نے وہ تھیلی کھولی تو اس میں سے بہلو نکل آیا، کسان بہلو کو دیکھ کر حیران ہوا اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے بہلو نے اسے سارا قصہ تفصیل سے بتا دیا۔ کسان نے بہلو سے کہا کہ اب تم جلدی سے اپنے گھر بھاگو، اس جادوگرنی کو میں دیکھتا ہوں۔

بہلو وہاں سے بھاگ کر سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ جبکہ دوسری طرف کسان اس تھیلی میں کانٹے اور پتھر وغیرہ بھر کر وہاں سے چلتا بنا۔ جادوگرنی پانی پی کر آئی اور تھیلی اٹھا کر جلدی جلدی گھر کی طرف روانہ ہوئی، اب تھیلی میں بہلو کی جگہ کانٹے اور پتھر تھے لیکن جادوگرنی کو پتا ہی نہیں چلا۔

چلتے چلتے جب جادوگرنی کو پیٹھ میں کانٹے چبھنے لگے تو وہ غصے سے بولی، ''اچھا اب تم میری چٹکیاں لے رہے ہو لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔'' پھر جب اس کو چلتے چلتے پیٹھ پر پتھر لگنے لگے تو پھر غصے سے بولی، ''مار لو جتنے کے مارنے ہیں، اب تو میں گھر پہنچنے والی ہوں جہاں تمہیں مجھ سے کوئی نہ بچا سکے گا۔''

اس طرح چلتے ہوئے وہ گھر پہنچ گئی، جہاں اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی رہتی تھی گھر آتے ہی اس نے تھیلی بیٹی کے سامنے رکھی اور بولی یہ لو بیٹی آج سے تمہیں کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا، اس تھیلی میں تمہارے لئے تحفہ ہے جس سے اب تم سارے کام کروا سکتی ہو۔

''اس کی بیٹی خوشی خوشی وہ تھیلی کھولنے لگی مگر جب اس تھیلی کو کھول کر دیکھا تو اس میں کانٹے اور پتھروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔ ''اس میں صرف پتھر اور کانٹے ہیں، کیا ہم ان کانٹوں اور پتھروں کو اپنا غلام بنائیں گے؟''

(جاری ہے)



آم کا درخت اور بلو

دوسری اور آخری قسط

نظر علی برمانی...... وادو

جادوگرنی نے جب یہ دیکھا تو بڑی حیران ہوئی اور سوچنے لگی کہ یہ سب کیسے ہو گیا میرا شکار کہاں چلا گیا، پھر وہ سمجھ گئی کہ جب میں پانی پینے گئی تھی، تبھی شکار کو بھاگنے کا موقع ملا ہو گا۔ اسے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا اور اسی وقت اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ اس بچے کو اپنا غلام بنا کر رہوں گی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ ایک دن بلو کو اسی درخت پر بیٹھے آم کھاتے دیکھ کر وہاں پہنچ گئی اور پہلے کی طرح وہاں کھڑی ہو کر رونے لگی اور کہنے لگی کہ بیٹا مجھے بھوک لگی ہے، تھوڑے آم دے دو۔ بلو نے جب دیکھا کہ یہ تو وہی جادوگرنی ہے جو اس دن مجھے اٹھا کر لے گئی تھی۔ تو بلو نے اسے کہا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو تم ایک جادوگرنی ہو، جو دھوکے سے مجھے اٹھا کر لے گئی تھیں، میں تمہیں آم نہیں دوں گا۔" جادوگرنی کہنے لگی کہ نہیں بیٹا میں جادوگرنی نہیں ہوں وہ کوئی اور ہوگی میں تو ایک غریب بوڑھی عورت ہوں لیکن بلو اب سمجھدار ہو گیا تھا اور اس کے جھانسے میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر جادوگرنی کہنے لگی کہ دیکھو بیٹا اگر تم کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو تم نیچے مت آؤ، بلکہ وہیں سے آم اپنی پگڑی میں باندھ کر نیچے لٹکاؤ میں پگڑی سے آم کھول لوں گی۔ بلو نے سوچا کہ یہ طریقہ صحیح ہے، پھر اس نے درخت سے کچھ آم توڑ کر اپنی پگڑی میں باندھے اور پھر وہ پگڑی نیچے لٹکائی۔ جادوگرنی نے سوچا کہ یہی موقع ہے شکار کرنے کا پھر اس نے بلو کی پگڑی کو نیچے سے پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا تو بلو جو اپنی پگڑی کا ایک سرا پکڑے ہوئے تھا، یہ جھٹکا برداشت نہ کر سکا اور نیچے گر گیا۔ جادوگرنی نے اس کو اٹھا کر تھیلی میں ڈالا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی، راستے میں اسے پھر پیاس لگی لیکن اس نے اپنی پیاس کی کوئی پروا نہیں کی اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا، اس نے جلدی سے تھیلی اپنی بیٹی کے آگے رکھی اور بولی یہ لو تمہارا تحفہ حاضر ہے، آج رات کھانے کے بعد میں اسے اپنا فرمانبردار غلام بنا لوں گی...... تب تک اس کا خیال رکھنا، میں ذرا باہر سے ہو کر ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر جادوگرنی باہر چلی گئی۔ جادوگرنی کی بیٹی نے تھیلی کھولی اور بلو کو باہر نکالا، اس نے جب بلو کے بال دیکھے تو بہت حیران ہوئی کیونکہ بلو کے بال بہت خوبصورت تھے اور اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ جادوگرنی کی بیٹی کو بھی اپنے بال خوبصورت بنانے کا بہت شوق تھا، اس نے بلو سے پوچھا۔ "تمہارے بال اتنے خوبصورت کیسے ہوئے ہیں تم اپنے بالوں میں کیا لگاتے ہو۔" بلو بولا۔ "کیا تم بھی اپنے بال خوبصورت بنانا چاہتی ہو؟" جادوگرنی کی بیٹی نے کہا۔ "ہاں بالکل میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے بال خوبصورت ہو جائیں۔"



پھر بلو نے اس کو کہا کہ تم مجھے ڈنڈا لا کے دو تا کہ میں تمہارے بال خوبصورت بنا دوں۔ جادوگرنی کی بیٹی نے جلدی سے اسے ڈنڈا لا کر دیا۔ بلو نے جلدی سے ڈنڈا اٹھایا اور زور سے اس کے سر پر دے مارا۔ ایک ڈنڈا کھا کر ہی جادوگرنی کی بیٹی بیہوش ہو گئی۔ بلو سوچنے لگا کہ اب کیا کروں، پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اس نے جلدی سے جادوگرنی کی بیٹی کو دروازے کے پیچھے چھپایا اور خود ڈنڈا لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جادوگرنی واپس آئی اور پوچھنے لگی کہ بیٹی کہاں ہو تم؟ مگر اس سے پہلے کہ اسے کوئی جواب ملتا، بلو نے جادوگرنی کے سر پر ڈنڈوں کی برسات کر دی۔ جادوگرنی اس افتاد پر بوکھلا گئی اور جلدی جلدی بلو سے معافی مانگنے لگی کہ بلو مجھے معاف کر دو، میں اب کبھی معصوم لوگوں کو تنگ نہیں کروں گی۔ آخر کار بلو رک گیا اور جادوگرنی سے بولا۔ "کیا آئندہ مجھے تنگ کرنے آؤ گی؟" جادوگرنی جلدی سے بولی۔ "نہیں...... کبھی نہیں۔ بلکہ اگر تم کہو تو ہم تمہارے کھیت میں تمہاری مدد بھی کریں گے اور تمہیں آم بھی توڑ کر دیا کریں گے۔" اس بات پر بلو بولا۔ "مجھے کسی اور سے خدمت کروانے کا بالکل شوق نہیں اور نہ ہی میں کسی پر ظلم کرتا ہوں۔ میں اپنے کھیت اور اپنے پیارے آم کے درخت کی دیکھ بھال خود کر سکتا ہوں، البتہ اگر تم اپنے کام خود کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔" اتنے میں جادوگرنی کی بیٹی بھی ہوش میں آ گئی اور دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "بلو! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کسی کو تنگ نہیں کریں گے۔" جب بلو کو یقین ہو گیا کہ دونوں سچ کہہ رہی ہیں اور اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہیں تو اس نے انہیں معاف کر دیا اور اپنے گھر کو روانہ ہونے سے پہلے مسکرا کر بولا۔ "آج سے مجھے اپنا دوست سمجھنا، اور جب بھی آم کھانے کا دل چاہے میرے باغ میں آ جانا۔ ہم مل کر آم کھائیں گے۔" اس طرح جادوگرنی، بلو کی عقلمندی سے سدھر گئی اور بلو وہاں سے سیدھا اپنے گھر اپنی نانی کے پاس پہنچ گیا اور ہنسی خوشی رہنے لگا۔ (ختم شد)

انوکھی بانسری

شہلا کرن۔ کراچی

حامد ایک غریب لڑکا تھا۔ بہت محنت کے بعد بھی اس کے دن نہیں بدلتے تھے۔ وہ اللہ سے دعا کرتا کہ اس کے حالات اچھے کردے، مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ ایک بستی میں ایک رحم دل انسان کے کچے مکان میں رہتا تھا۔ اس کے تمام گھر والے ایک زلزلے میں مر چکے تھے۔ اس نے گھر میں ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی جس پر چھوٹی موٹی چیزیں بیچتا تھا۔ ایک روز وہ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس نے ایک سنہری اور خوب صورت بانسری دیکھی۔ اس نے پہلے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں، پھر خود سے سوال کیا: ''کیا میں اسے اٹھا لوں؟''

اس کے دل نے جواب دیا: ''اٹھا لو، مگر اس کے مالک کو تلاش کرو۔'' چناں چہ اس نے بانسری اٹھا لی۔ کچھ دن تو وہ اس کے دعوے دار کو ڈھونڈتا رہا، لیکن جب کوئی نہ ملا تو حامد نے اسے خدائی مدد سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس نے کئی بار بانسری کو بجانے کی کوشش کی، مگر اس میں سے کوئی آواز نہ نکلی تو اس نے بانسری دکان میں رکھ دی اور سوچا کہ کسی وقت اسے بیچ دوں گا۔

ایک روز وہ اپنی دکان پر بیٹھا تھا کہ دو آدمی آئے اور اس سے کوئی چیز مانگی۔ اس نے وہ چیز نکالی ہی تھی کہ سنہری بانسری خود بخود بجنے لگی جسے سن کر وہ دونوں آدمی بے ہوش ہو گئے۔

حامد نے ان کی تلاشی لی تو ان کے پاس نوٹوں سے بھرے ہوئے تھیلے نکلے۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے آتے ہی ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔ وہ دونوں لٹیرے تھے جن کی تلاش میں پولیس کافی عرصے سے تھی۔ چناں چہ پولیس نے حامد کو انعام بھی دیا۔ اب حامد پر بانسری کا راز کھلا اور وہ اس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ ایک دن وہ بس میں سفر کر رہا تھا کہ بانسری نے خود بہ خود بجنا شروع کر دیا۔ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ حامد نے بس میں سفر کرنے والوں سے کہا: ''اس کے بجنے کا مطلب یہ ہے کہ بس میں کوئی غلط آدمی موجود ہے، شاید کوئی چور!''

یہ سنتے ہی سب لوگ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے بس کے مسافروں کو چیک کیا تو دو جیب کترے ملے جو بے ہوش ہو چکے تھے۔ بس والوں نے حامد کا بہت شکریہ ادا کیا اور اسے انعام بھی دیا۔

ایک روز وہ بینک گیا تو وہاں بھی بیگ میں رکھی ہوئی بانسری بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے گارڈ کو خبردار کر دیا اور بینک سے دو آدمی بے ہوشی کی حالت میں گرفتار ہوئے جن کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ بینک والوں نے بھی حامد کو انعام دیا۔ کچھ ہی عرصے میں جادوئی بانسری کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ آخر شہر کے حاکم نے اسے بلایا اور اس سے کہا: ''تم یہ بانسری ہمیں تین لاکھ روپے میں دے دو۔''

حامد نے کچھ دیر سوچا اور پھر راضی ہو گیا۔ اس نے رقم لی اور بانسری حاکم کے حوالے کر دی۔ مگر پھر اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس بانسری سے حاکم کا مال لوٹ لوں۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ بانسری کی آواز سنائی دی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ محافظوں نے اسے پکڑ کر حاکم کے سامنے پیش کر دیا۔ ہوش میں آنے پر حاکم نے اسے خوب ملامت کی۔

کچھ دن تک تو حاکم بانسری کے ذریعے مجرموں کو پکڑتا رہا مگر پھر اس کی بھی نیت بدل گئی اور اس نے اس کے ذریعے لوگوں پر ظلم و زیادتی شروع کر دی۔ پھر ایک روز حاکم کا دماغ خراب ہوا تو اس نے بانسری کو خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کچھ دیر بعد وہ ٹکڑے بھی خود بخود غائب ہو گئے۔ ☐

انوکھی شرط

لائبہ الیاس بھٹی۔ کراچی

پرانے وقتوں میں کسی گاؤں میں ایک ظالم زمیں دار رہتا تھا جو غریب کسانوں سے بہت زیادہ کام لیتا تھا لیکن بدلے میں بہت کم اجرت دیتا تھا۔ زمیں دار کی بیوی بہت رحم دل تھی۔وہ اپنے شوہر کو ایسا کرنے سے منع کرتی لیکن زمیں دار اس کی ایک نہ سنتا۔

ایک روز سورج آگ برسا رہا تھا۔ایسی شدید گرمی میں پسینے میں شرابور مزدور تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے ، تاکہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کام شروع کریں۔اسی وقت زمیں دار کی گاڑی کی آواز سنی تو وہ سب پریشان ہوگئے اور سوچنے لگے کہ اب ہماری خیر نہیں۔

زمیں دار آتے ہی غصے میں آگ بگولہ ہو کر چیخا:"تم لوگ کام کرنے کی اجرت لیتے ہو یا آرام کرنے کی؟ یہ سارا کام کون کرے گا؟ان تمام کھیتوں میں کام کرو، مجھے یہ سارا کام آج مکمل چاہیے۔"

غریب مزدوروں نے جلدی جلدی اپنی اپنی کدالیں اور بیلچے اٹھائے اور زمین کھودنے لگے۔اچانک ایک بوڑھے مزدور کی کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔مزدور کام کرتے کرتے رکا،اس نے وہ چیز باہر نکالی جو پیتل کی ایک بوتل تھی۔اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ سینکڑوں سال سے وہاں پڑی ہے۔بوڑھے نے سب مزدوروں کو بلایا تو ایک مزدور بولا:"اسے جلدی کھولو، ضرور اس میں کوئی خزانہ ہے۔"

غرض جب بوتل کا ڈھکن ہٹایا گیا تو اس کے اندر سے دھوئیں کا ہیولہ سا باہر نکلا اور ایک دیو میں تبدیل ہوگیا۔یہ دیکھ کر سب مزدور ڈرے، مگر دیو نے ادب سے سر جھکایا کر کہا:"آقا! میں صدیوں سے اس بوتل میں بند تھا، آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے آزاد کر دیا۔اب میں آپ کا غلام ہوں، آپ کا ہر حکم مانوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے، وہ یہ کہ میں فارغ نہیں بیٹھ سکتا۔اگر میں فارغ رہوں تو مجھے بھوک لگتی ہے اور میں اپنے مالک کو کھا جاتا ہوں۔اب جلدی سے مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔"

یہ سنتے ہی ایک مزدور نے کہا:"جلدی سے یہ کھیت کھود دو۔"

وہ فوراً ہی اپنے کام پر لگ گیا۔مزدوروں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ دیو سارا کھیت کھود کر ان کے سر پر آن کھڑا ہوا اور بولا:"اب میں کیا کروں؟"

"ہمارے دوسرے کھیت کی فصل پک چکی ہے،وہ کاٹ دو۔"بوڑھے مزدور نے کہا تو دیو اس حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب زمیں دار واپس آیا تو سارے مزدور فارغ بیٹھے تھے،پورا کھیت کھد چکا تھا اور دوسرے کھیت کی فصل خود کٹ رہی تھی۔زمیں دار سارا معاملہ سمجھ گیا۔اس نے بوڑھے مزدور کے ہاتھ سے بوتل چھینی اور کہا: "یہ میرے کھیت سے ملی ہے۔اس پر میرا حق ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سب مزدوروں کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔پھر وہ گھر گیا اور اپنی بیوی کو بوتل دکھا کر بولا:"اب بغیر اجرت کے ہمارے سارے کام ہو جائیں گے۔"اس کے بعد واقعی سب کام مفت میں ہونے لگے: کھیتوں میں پانی لگانا، فصل کاٹنا، بیج بونا، باغوں سے پھل چننا غرض زمیں دار جو کام بھی بتاتا تا،دیو چند گھنٹوں میں ختم کر کے کہتا:"مجھے کام بتاؤ، میں کیا کروں ورنہ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔"

اب تو زمیں دار بہت فکر مند ہوا۔یہ دیکھ کر اس کی بیوی نے کہا:"تمہیں تمہارے لالچ اور ظلم کی سزا مل رہی ہے۔میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔اس کے بعد لالچ نہ کرنا اور مزدوروں کو ان کی پوری اجرت دینا۔"

زمیں دار نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا اور بوتل اپنی بیوی کو دے دی۔اس کی بیوی نے کہا:"اب تم جا کر آرام کرو ،دیو سے میں خود نمٹ لوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد دیو زمیں دار کی بیوی کے پاس آیا اور زور سے بولا:"مجھے کام بتاؤ، میں کیا کروں ورنہ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔"

زمیں دار کی بیوی نے اپنے پالتو کتے ٹومی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:"جاؤ،اس کتے کی دم سیدھی کر دو ورنہ میں تمہیں دوبارہ اس بوتل میں بند کر دوں گی۔" وہ دن اور آج کا دن، دیو ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔زمیں دار کی بیوی کی ذہانت کی وجہ سے سب ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گئے، زمیں دار کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا!n

امی کی نصیحت

شائستہ انجم (واہ کینٹ)

رات کے کھانے کا وقت ہوا تو امی نے حماد اور حمنہ کو آواز دی کہ دستر خوان پر آجائیں۔ آج تو سبھی کو بہت بھوک لگ رہی تھی، پہلی ہی آواز پر سب ہاتھ دھو کر پہنچ گئے۔ اسی دوران امی کا موبائل بجا تو امی اٹھ کر کمرے تک گئیں۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ کمرے کی لائٹ بھی جل رہی تھی اور پنکھا بھی تیزی سے چل رہا ہے۔ امی نے وہ سب بند کیا اور فون سننے کے بعد دستر خوان پر پہنچیں۔

جب سب کھانا کھا چکے تو امی نے کہا: "ہماری ماسی بیمار ہے، اسے دیکھنے ہم سب کو گاؤں جانا ہے۔"

یہ خبر سن کر بچے بہت خوش ہوئے کہ وہ بھی گاؤں دیکھیں گے۔

دوسرے دن سہ پہر کو امی ابو، حماد اور حمنہ گاڑی میں سوار ہوئے اور ماسی کے گاؤں کے لیے روانہ ہوگئے۔ بیس منٹ بعد وہ گاؤں میں تھے جہاں ہر طرف ہریالی، کھیت، کھلیان اور کھلے میدان تھے، کہیں کہیں پانی کے تالاب اور کنوئیں بھی تھے جہاں سے کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں اور کچھ کپڑے دھو رہی تھیں۔

بچے میدان میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں میں کچے پکے مکانات تھے، انہی میں ایک چھوٹا سا کچا مکان ماسی کا بھی تھا جو کھلے صحن اور دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ حماد اور حمنہ تمام ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ امی ابو نے ماسی کے گھر کے بوسیدہ دروازے پر دستک دی تو ماسی کی بیٹی نے دروازہ کھولا اور مہمانوں کو اندر کمرے میں لے گئی جہاں ماسی چارپائی پر لیٹی تھی۔ ماسی کی بیٹی نے سادہ پانی میں چینی گھول کر وہ شربت مہمانوں کو پیش کیا۔ امی ابو نے شربت پی لیا، مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ حماد اور حمنہ نے ماسی کی بیٹی کے ہاتھ سے شربت نہیں لیا تھا۔

ابو امی نے ماسی کا حال پوچھا اور اس کے منع کرنے کے باوجود کچھ روپے اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ اسے آرام کرنے کی تاکید اور ضرورت پڑنے پر فون کرنے کا کہہ کر واپس روانہ ہوگئے۔

روانگی سے پہلے ماسی کی بیٹی نے انھیں گاؤں کی سوغات یعنی دلکش رنگوں اور ستاروں سے سجی ایک پنکھی تحفے میں دی جسے حمنہ نے امی کا اشارہ پاتے ہی خوش دلی سے قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ واپس روانہ ہوگئے۔ راستے میں حماد اور حمنہ نے دور سے امی ابو کو مٹی کے ٹیلوں کے اندر بنے کچے گھروندے دکھائے جو دور سے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

ابو بولے: "بیٹا! یہ گھر پانی، بجلی اور گیس جیسی سہولیات سے محروم ہیں اور بارش کے موسم میں بہہ جاتے ہیں یا گر جاتے ہیں جس کے بعد سب گھر والے مل کر انہیں دوبارہ بناتے ہیں۔ ہمیں ہر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں شہروں میں رہنے کے لیے پکے اور مضبوط گھر دیے ہیں ورنہ خدا جب چاہے ہمارے پختہ گھروں کو بھی تنکوں کی طرح بارش میں بہا دے۔"

اس موقع پر امی نے بچوں کو نصیحت کی: "بچو! ہمیں جدید سہولیات کی قدر کرنی چاہیے، بعض لوگ تو ان سے محروم ہیں۔ ہمیں بجلی سے جلنے والی لائٹیں اور پنکھے استعمال کے بعد بند کر دینے چاہئیں۔ ترقی یافتہ اقوام کی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وقت اور توانائی کو سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہیں۔" امی کی بات سنتے ہی بچے سمجھ گئے کہ امی کیا بتانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ امی کی نصیحت پر عمل کریں گے۔ n

عروسہ سب سمجھ گئی

ثناء اکرم۔ کوٹ راجا (سرگودھا)

خلاف معمول آج چڑیوں کا شور عروسہ کو برا نہیں لگ رہا تھا، بلکہ شور مچاتی اور ایک سے دوسری شاخ پر اڑتی، پھدکتی چڑیاں اسے بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ یہ پرندے ایک دوسرے کے بغیر کیوں نہیں رہ سکتے؟ اگر کوئی پرندہ ایک جگہ سے اڑ جائے تو باقی سب بھی وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ عروسہ نے سوچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آج اسکول میں ہر طرف رونق تھی۔ بچے عید ملن پارٹی کا سارا سال انتظار کرتے تھے، تاکہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ عید کی خوشیوں کو دوبالا کر سکیں۔ اس وقت سب بچے خوب صورت کپڑوں میں ملبوس تھے اور بچیاں تو پیارے پیارے لباس پہنے تتلیوں کی مانند ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ اتنے میں عروسہ اپنی قیمتی فراک سنبھالے کلاس میں داخل ہوئی تو سب لڑکیاں اس کے پاس جمع ہو گئیں۔

''عروسہ! تمھاری فراک تو بہت مہنگی لگ رہی ہے۔ اور یہ بالیاں بھی اصلی سونے کی ہیں۔ ہے ناں؟''

غرض ہر کوئی اس کی تعریف کر رہا تھا جس سے عروسہ کی غرور سے تنی ہوئی گردن مزید تن گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب کھیلنے کے لیے جانے لگیں تو مہرین بولی: ''عروسہ! تم بھی آؤ ناں ہمارے ساتھ، مل کر کھیلیں گے۔''

''میں نہیں آ رہی، میرا لباس بہت مہنگا ہے، خراب ہو جائے گا۔ تمہارے لباس معمولی اور سستے ہیں، تم چلی جاؤ۔''

''عروسہ نے بے رخی سے کہہ کر منہ پھیر لیا تو وہ سب باہر چلی گئیں اور عروسہ بے پروائی سے اپنی کلائی میں پڑے کنگن کو گھمانے لگی۔

پھر دن گزرتے چلے گئے اور عروسہ اپنے غرور کی وجہ سے دنیا سے کٹتی چلی گئی۔

''ثمن میرا پین واپس کرو۔'' عروسہ نے بہت اونچی آواز میں کہا تو ساری کلاس اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کون سا پین؟ میرے پاس تمہارا کوئی پین نہیں ہے۔'' ثمن نے بھی بے پروائی سے کہا تو عروسہ پھٹ پڑی۔

''جھوٹ مت بولو۔ صبح جب میں سب کو وہ پین دکھا رہی تھی تو تم حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، لیکن چوں کہ تم اتنا مہنگا پین خرید نہیں سکتی تھیں، اس لیے تم نے میرا پین چرا لیا۔'' عروسہ کے یہ الفاظ ثمن کو اندر تک گھائل کر گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بری بات عروسہ!'' مس نادیہ نے مداخلت کی: ''یوں ہی کسی پر الزام نہیں لگاتے۔''

اور پھر مس نادیہ کے کہنے پر ثمن نے بیگ کھول کر سب کے سامنے رکھ دیا، مگر پین ہوتا تو ملتا۔ اب تو عروسہ بھی پریشان ہو گئی کہ اسے اپنا پین ثمن کے بیگ میں کیوں نہیں ملا۔

''عروسہ! آپ اپنا بیگ دوبارہ چیک کریں۔'' مس نادیہ نے کہا تو عروسہ اپنا بیگ دوبارہ دیکھنے لگی اور پھر واقعی بیگ کی اندرونی جیب سے اسے اپنا پین مل گیا۔

ساری کلاس حیران تھی کہ عروسہ نے ثمن پر بلاوجہ الزام کیوں لگایا۔ سب لڑکیاں توقع کر رہی تھیں کہ اب عروسہ شرمندہ ہو گی اور ثمن سے معافی مانگے گی، مگر عروسہ نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس نے اپنا پین اٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اسی طرح کے اور بہت سے واقعات عروسہ کو اپنی ہم جولیوں سے دور کرتے گئے اور وہ اپنی ذات کے خول میں ہی قید ہو کر رہ گئی۔

جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ غلطی اسی کی ہے۔ اگر وہ دوسروں کے ساتھ غرور اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہ کرتی تو شاید وہ اس طرح تنہا نہ ہوتی۔ مگر اب تو یہ سب ہو چکا تھا۔ کبھی اسے چہچہاتی چڑیاں بہت بری لگتی تھیں اور وہ ان کا شور برداشت نہیں کرتی تھی، مگر آج اسے ان کی چہچہاہٹ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ واقعی ان چڑیوں نے اسے ایک نیا سبق دے دیا تھا۔ وہ ان شور مچاتی اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑتی، پھدکتی چڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی کہ یہ پرندے کتنے خوش قسمت ہیں کہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا میل ملاپ اور اتحاد انسانوں کے لیے ایک سبق ہے۔ یہ ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ اگر کوئی پرندہ ایک جگہ سے اڑ جائے تو باقی سب بھی وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ عروسہ نے سوچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب وہ بھی ان پرندوں کی طرح اپنی تمام سہیلیوں اور کلاس و اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مل جل اور گھل مل کر رہے گی اور اپنے آپ کو ان سے الگ یا برتر نہیں سمجھے گی۔ n

اصل خوبی

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

بارش بند ہو چکی تھی۔ تمام بچے اسکول پہنچ چکے تھے۔ دوسرے بچوں کی طرح عافیہ بھی ایک خوب صورت ست رنگی چھتری تھامے اسکول میں داخل ہوئی۔ اس کی چھتری بہت خوب صورت تھی۔ اس نے اپنی تمام سہیلیوں کو بتایا: ”چھتری مجھے جاپان سے میری خالہ جان نے بھیجی ہے۔“

یہ سن کر صاعقہ بولی: ”مگر ایسی چھتریاں تو ہمارے پاکستان میں بھی ملتی ہیں۔“

صائمہ نے جلدی سے کہا: ”واہ عافیہ! ایسا لگتا ہے کہ تمہاری خالہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔“

کچھ روز بعد عافیہ صندل کی لکڑی سے بنا ہوا ایک قلم اسکول لائی۔ وہ قلم نہ صرف منفرد، بلکہ خوش بودار بھی تھا۔ کلاس کے ہر اسٹوڈنٹ نے اس قلم کی خوش بو سونگھی اور خوب تعریف بھی کی۔ یہ سب دیکھ کر عافیہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ کچھ ہی روز بعد ان سب نے عافیہ کے ہاتھ میں ایک ایسا قلم بھی دیکھا جس میں سیل سے چلنے والی چھوٹی سی گھڑی بھی فٹ تھی۔ عافیہ کی شیخی خوریاں اب بڑھتی جا رہی تھیں، مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو اس کی ان باتوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے اور نہ ہی اس کی کسی بھی عمدہ چیز سے متاثر ہوتے تھے۔

عافیہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہم جماعت عارفہ، صاعقہ اور طاہرہ جیسی معروف طالبات بننا چاہتی تھی جو اپنی لیاقت، ذہانت اور معلومات کی بنا پر تمام ٹیچرز کی آنکھوں کا تارا تھیں اور کلاس میں بے حد مقبول تھیں۔

طاہرہ فی البدیہہ تقاریر میں ماہر تھی تو صاعقہ بزم ادب کی ہر محفل کی جان تھی۔ اسے علامہ اقبال کے اشعار سے لے کر قائداعظم جیسی عظیم ہستیوں کے اقوال اور ادبی لطائف تک زبانی یاد تھے۔ مگر عافیہ میں ایسی کوئی خوبی نہ تھی، جب کہ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ کاش وہ بھی اچھی ڈرائنگ کر سکے یا تقاریر میں انعام حاصل کرے اور یا کچھ ایسا کرے کہ تمام بچے اور اساتذہ اس کی تعریف کریں۔ جب ایسا کچھ نہ ہو سکا تو اس نے اب اپنی کلاس میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اور اپنے دوستوں میں اضافے کے لیے خوب پیسے خرچ کرنے شروع کر دیے۔ وہ اسکول میں وقفے کے دوران اپنے تمام دوستوں کو کچھ نہ کچھ خرید کر کھلاتی تھی۔ اس طرح سچ مچ اس کی سہیلیوں اور دوستوں میں اضافہ ہو گیا۔

ایک روز عافیہ کی شیخی خوریوں کا پول کھل گیا۔ ہوا یوں کہ وہ صبح اسکول آئی تو بہت خاموش اور چپ چپ تھی۔ طاہرہ نے اس سے خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ خاموش رہی۔ پھر وقفہ ہوا تو آج اس کے پاس بالکل پیسے نہ تھے کہ کچھ خرید کر کھا سکے۔ اس کے تمام دوست اور ہم جماعت اسے گھیرے بیٹھے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ وہ خاموش کیوں ہے کہ اتنے میں اس کا چھوٹا بھائی آ گیا۔ وہ اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس نے عافیہ کی خاموشی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ کل عافیہ کو امی سے بہت ڈانٹ پڑی ہے، کیوں کہ وہ امی کے پرس سے اکثر پیسے چرا لیتی تھی۔

یہ بات سن کر عافیہ کے گرد بیٹھے تمام دوستوں کا گروپ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گیا اور اب وہ بالکل اکیلی ہو گئی۔ ہر کوئی اس سے کترانے لگا۔ اس موقع پر طاہرہ اس کے پاس آئی اور اسے ایک صفحہ دیتے ہوئے بولی: ”اس میں بچوں کے عالمی دن پر ایک مضمون ہے۔ یہ دن اگلے ہفتے اسکول میں منایا جائے گا۔ تم اس موقع پر یہ مضمون پڑھو گی۔“

عافیہ گھبرا کر بولی: ”مگر یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔“

طاہرہ نے کہا: ”کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں تمہیں تیاری کراؤں گی۔ تم روز وقفے میں مجھے یہ مضمون زبانی سناؤ گی۔“

پہلے تو عافیہ الجھی رہی، مگر آخر کار وہ راضی ہو گئی۔ اس نے طاہرہ کی مدد سے تیاری کی اور بچوں کے عالمی دن کے موقع پر وہ مضمون اعتماد سے پڑھنے میں کامیاب رہی۔

پرنسپل صاحبہ نے اپنی تقریر میں بزم ادب میں نئے بچوں کی شمولیت کی تعریف کی اور خاص طور سے عافیہ کی الفاظ کی ادائیگی کو بہت سراہا۔ تمام مہمانوں اور بچوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ عافیہ نے شکر گزاری سے طاہرہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ انسان کی اصل خوبی پیسہ نہیں، بلکہ اس کی قابلیت، صلاحیت اور اچھائی ہے۔n

ساگرائیں ناصر ...... چنیوٹ

کسی گاؤں میں بشیر نامی کسان رہتا تھا۔ وہ بہت نیک دل اور ایماندار تھا۔ اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے ہی گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ لوگ اپنی چیزیں امانت کے طور پر اس کے پاس رکھواتے تھے۔

ایک دن معمول کے مطابق صبح سویرے کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک تھیلی نظر آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر تھیلی اٹھالی۔ تھیلی کھول کر دیکھی تو وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کسان تھیلی لے کر کھیتوں میں جانے کی بجائے گھر واپس آ گیا اور اپنی بیوی کو بتایا۔ جب اس کی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس میں اشرفیاں ہیں تو اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ہم یہ تھیلی رکھ لیتے ہیں اور فوراً یہاں سے چلے جاتے ہیں، شہر جا کر ہم بڑا



سا گھر بنائیں گے اور اس میں آرام سے رہیں گے۔

بیوی کے کہنے کے باوجود کسان لالچ میں نہ آیا اور کہنے لگا۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس تھیلی کے مالک کو ڈھونڈ کر اشرفیاں اس تک پہنچاؤں گا۔ یہ تھیلی تمہیں راستے میں ملی ہے تم نے کوئی چوری تو نہیں کی۔ اس کی بیوی اسے تھیلی رکھنے کے لئے جواز پیش کر رہی تھی مگر کسان نے بیوی کی بات نہ مانی اور تھیلی لے کر باہر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے گاؤں کا چوہدری ملا، وہ کسان کے پاس آیا اور پوچھنے لگا تم اس وقت کھیتوں میں کام کرنے کے بجائے یہاں نظر آ رہے ہو۔ خیریت تو ہے۔ کسان نے تمام واقعہ چوہدری کو بتایا اور کہا میں اس تھیلی کے مالک کو ڈھونڈ رہا ہوں تا کہ اس کی امانت اس تک پہنچا دوں۔ اس کی بات سن کر چوہدری مسکرایا اور بولا۔ یہ تھیلی تمہارا انعام ہے۔ یہ سن کر کسان حیران ہوا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ انعام...... مگر کیوں؟ چوہدری نے جواب دیا۔ میں نے گاؤں بھر میں تمہاری ایمانداری کے چرچے سنے تھے، اس لئے میں نے یہ تھیلی تمہارے راستے میں رکھ دی تھی کیوں کہ صبح سویرے اتنی جلدی تمہارے علاوہ یہاں سے کوئی نہیں گزرتا۔ مگر کیوں؟ کسان نے پوچھا۔ تمہاری ایمانداری کو آزمانے کے لئے۔ اب وہ تھیلی تمہارا انعام ہے۔ چوہدری نے کہا۔ کسان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود چوہدری نے تھیلی واپس نہ لی۔ کسان خوشی خوشی گھر آیا، اس نے اشرفیوں کی تھیلی اپنی بیوی کو دی اور کہا۔ اگر میں تمہارے کہنے پر لالچ کرتا تو ہرگز ہرگز انعام میں یہ تھیلی نہ ملتی، پھر اس نے چوہدری سے ہونے والی گفتگو اپنی بیوی کو بتا دی۔ کسان نے کچھ اشرفیاں غریبوں کو دیں اور بیوی کو لے کر شہر چلا گیا، وہاں اس نے ایک گھر خریدا اور کاروبار کر کے خوش و خرم زندگی گزارنے لگا۔

اسجد کی گلی

نرگس عامر۔ کورنگی، کراچی

اسجد روزانہ صبح جب بھی اسکول جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا تو اپنی گلی سے گزرتے ہوئے اسے جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر نظر آتے جنھیں دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوتا اور اس کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جاتا۔ اس کے محلے کے لوگ اپنے گھروں کو تو صاف رکھتے تھے، لیکن گھروں کا سارا کچرا گلی میں پھینک دیتے۔ ایک دو گھروں کے اطراف کا حصہ صاف ستھرا ہوتا تھا جن میں اسجد کا گھر بھی شامل تھا۔ محلے کے بچے گلی میں کھیلتے تو جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر دیکھ کر ان کا بھی دل خراب ہوتا، مگر وہ کیا کرتے، مجبوری تھی، بچے کھیلے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ سب سے زیادہ کچرا ثریا خالہ کے گھر کے باہر ہوتا تھا۔ سبزی اور پھلوں کے چھلکے اور مرغی کی ہڈیاں وہ گلی میں پھینک دیتیں، تاکہ محلے والوں کو پتا چلے کہ وہ بھی کھاتی پیتی ہیں۔ کوئی بھی نیا کپڑا سلتا تو اس کی دھجیاں بھی باہر ہی پھینک دیتیں، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ نئے کپڑے سی رہی ہیں۔ گلی کے بچے بہت شرارتی تھے، انہوں نے ثریا خالہ کو ”کچرا خالہ“ کا نام دیا تھا۔ اسجد کے سامنے والے چچا بشیر پان بہت کھاتے تھے، ان کی عادت تھی کہ وہ جہاں بھی کھڑے ہوتے، وہیں پان کی پچکاریوں سے نقش و نگار بنا دیتے۔ اسی لیے بچوں نے انھیں ”چاچا گل کاری“ کا لقب دیا تھا۔ موٹر سائیکل کے شوقین فیضان بھائی ہر اتوار کو اپنی چہیتی بائیک گلی میں دھوتے تھے۔ لیکن وہ بچوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے تھے اور انہیں کھلاتے پلاتے بھی تھے، اسی لیے بچوں نے ان کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ منی آپا روزانہ اپنی گیلری دھوتیں جس سے گلی میں پانی کھڑا ہو جاتا۔ جمعدار ہفتہ دس دن میں ایک بار چکر لگاتا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کی غیر ذمے داری اور بے پروائی کا فائدہ اٹھاتا تھا اور ٹھیک سے صفائی نہیں کرتا تھا۔

اسجد اور اس کے گھر والے بہت صفائی پسند تھے۔ اس کی امی اس سے کہتیں: ”اسجد بیٹا! صفائی نصف ایمان ہے۔ صفائی پسند بچوں کی سب تعریف کرتے ہیں اور گندے بچوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔“

شاید اسی لیے اسجد خود بھی صاف ستھرا رہتا اور اپنی چیزوں کو بھی صاف رکھتا تھا۔ لیکن محلے کی صورت حال دیکھ کر وہ بہت کڑھتا تھا۔ کافی سوچنے کے بعد اسجد نے اپنے ایک ساتھی حامد کو اپنے ساتھ ملایا۔ چھٹی والے دن ان دونوں نے سب سے پہلے تو ہاتھوں میں گلوز پہنے اور منہ پر رومال باندھا، پھر بڑے بڑے شاپرز میں سارا کچرا بھرا اور اسے کچرے خانے میں پھینک آئے۔ اس کے بعد انھوں نے پوری گلی کی اچھی طرح سے صفائی کی اور پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا۔ کچھ دیر میں پوری گلی کا نقشہ بدل گیا۔ سب گلی والے حیران تھے کہ کیا یہ صاف و شفاف گلی واقعی ہماری ہے۔ ثریا خالہ نے دروازے سے باہر جھانکا تو حیران رہ گئیں۔

ان کے ہاتھ میں جو کچرے کا تھیلا تھا، وہ شرمندگی کے عالم واپس اندر لے گئیں۔ اسجد اور حامد دونوں نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر باہر آئے۔ اب سب کچھ نکھرا نکھرا الگ رہا تھا۔ گلی والے گلی میں کچرا پھینکتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ وہ شرمندہ بھی تھے کہ جو کام ہم بڑوں کو کرنا چاہیے تھا، وہ ان بچوں نے کر دکھایا۔ اسجد اور حامد کے والدین بھی اپنے بیٹوں پر فخر کر رہے تھے۔ چچا گل کاری ان بچوں کے حوصلہ افزائی کے لیے آگے بڑھے اور بولے: ”واہ میاں! تم دونوں تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ ہمیں بھی کہا ہوتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ لگ جاتے۔ بھئی واہ کیا شکل نکل آئی ہے گلی کی، لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی گلی ہے جہاں سے گزرتے ہوئے منہ پر رومال رکھنا پڑتا تھا۔“

اس سے زیادہ چچا کچھ نہ بول سکے، انھوں نے پان تھوکنے کے لیے دوسری طرف منہ کیا تو اسجد اور حامد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، مگر اگلے ہی لمحے چچا بھاگ کر اپنے گھر میں چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کا منہ خالی تھا۔ یہ دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ اس کے بعد محلے والے اپنے گھروں کا کوڑا ڈسٹ بن میں ڈالنے لگے۔ کچرا اٹھانے والے کو بھی سختی سے تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ روزانہ محلے کی صفائی کرے۔ بچے اب ہنسی خوشی گلی میں کھیلتے ہیں۔ n

اٹلانٹس: ایک گم شدہ شہر

محمد عماد۔ کراچی

لگ بھگ ڈھائی ہزار سال پہلے یونانی سائنس داں اور فلسفی افلاطون نے ایک پیچیدہ اور خوب صورت شہر کے بارے میں لکھا تھا جو ایک ہی رات میں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ افلاطون کا کہنا تھا کہ یہ شہر زلزلوں اور سیلاب کی وجہ سے تباہ ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ شہر ایک افسانہ بن کے رہ گیا ہے۔ لیکن خزانہ تلاش کرنے والوں، مہم جوؤں اور سائنس دانوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، وہ آج بھی اس شہر کی تلاش میں ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کہاں واقع تھا۔ تحقیق دانوں نے کیوبا کے ساحل کے قریب ایک گم شدہ شہر دریافت کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی اٹلانٹس ہے۔ مگر دوسرے سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ اٹلانٹس جنوبی اسپین میں مٹی اور دلدل کے اندر کہیں واقع ہے، جب کہ کچھ کا یہ خیال ہے کہ یہ شہر بحیرۂ روم میں کسی جگہ موجود ہے۔

اس سے پہلے ارضیاتی ماہرین نے متعدد گم شدہ شہر تلاش کیے جن میں پوم پیائی اور ابار کے شہر شامل ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ سب شہر یا تو زلزلوں کی وجہ سے تباہ ہوئے یا آتش فشاں پھٹنے سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ بعض شہروں کی تباہی کا سبب سونامی تھے۔ 373 قبل مسیح میں بحیرۂ روم کا ایک شہر Helike ایک خوف ناک زلزلے کی وجہ سے مکمل طور

تباہ ہو گیا تھا۔ سونامی کی قاتل لہریں جب اس جزیرے نما سے ٹکرائیں تو انہوں نے کسی بھی ذی روح کو زندہ سلامت نہ چھوڑا۔

1961 میں ماہرین نے یہ انکشاف بھی کیا کہ قدیم ترین یونانی ساحلی شہر Pavlopetri کوئی تین ہزار سال پہلے سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔

لیکن کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے جو افلاطون نے اس لیے گھڑی تھی، تاکہ وہ لوگوں کو لالچ کے نقصانات سے آگاہ کر سکے۔ پہلے افلاطون نے یہ بتایا کہ اٹلانٹس لیبیا اور ایشیا کو ساتھ ملائیں، اس سے بھی بڑا ہے۔ افلاطون نے لکھا ہے کہ Poseidon کے سب سے بڑے بیٹے اٹلس کو پورے جزیرہ نما اٹلانٹس کا بادشاہ بنایا گیا تھا۔ افلاطون کے مطابق: اٹلس کے نام پر ہی بحر اوقیانوس کو اٹلانٹک اوشن کا نام دیا گیا تھا۔ جب کہ ایک اور جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ اٹلانٹس وہ نقطہ ہے جہاں longitude یعنی طول البلد صفر ہوتا ہے۔

ڈونلے نامی ایک قدیم رائٹر نے 1882 میں اٹلانٹس پر ایک کتاب شائع کی جس میں لکھا ہے: یہ ایک ایسی قدیم دنیا ہے جس کے بارے میں ابھی تک سب کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ باغ عدن اسی اٹلانٹس میں واقع تھا اور اس شہر کو عظیم و قدیم طوفان نے برباد کر دیا تھا۔

آج بھی لوگ اس گم شدہ شہر اٹلانٹس کو تلاش کر رہے ہیں۔

2011 میں ایک پروفیسر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اٹلانٹس جنوب مغربی اندلس میں کہیں واقع ہے اور وہ ایک بار پھر اس گم شدہ شہر کی تلاش میں لگ گئے ہیں۔ دیکھیے اٹلانٹس کے بارے میں اصل حقائق کب معلوم ہوتے ہیں۔n

صبح کا بھولا

طارق گولڈن۔ کراچی

کرائیکے مکان میں رہنے والے وحید کچھ دن سے پریشان تھے جسے ان کے دفتر کا ساتھی جمیل بھانپ گیا۔ جیسے ہی وقت ملا تو جمیل نے ان سے پوچھا: ”وحید بھائی! کیا بات ہے میں آپ کو کچھ دن سے پریشان دیکھ رہا ہوں؟“

وحید نے آہ بھر کر کہا: ”ہاں، تمہیں تو پتا ہے کہ لگی بندھی تنخواہ میں مکان کا کرایہ، بچوں کی فیس، وین کا کرایہ اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنا کتنا مشکل ہے۔ ایسے میں اگر گھر چوری ہو جائے تو پریشان ہونا فطری بات ہے ناں!“

”اچھا، آپ کے گھر میں چوری ہوئی ہے؟“ جمیل بولا۔

”چوری کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن مسلسل دو دن تک چوری ہونا، یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔“ وحید نے کہا۔

”تمہیں کس پر شک ہے؟ چوری کس وقت ہوئی؟ اس وقت تم گھر پر تھے یا آفس میں؟“ جمیل نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”مسلسل دو دن تک! صبح میں فجر کی نماز پڑھنے گیا تو واپسی پر پہلے چار ہزار روپے میرے بٹوے سے غائب ہوئے، دوسری دفعہ بیگم کو تحفے میں دیا ہوا موبائل فون غائب تھا۔“

”اچھا! پھر تو چوری ہونی ہی تھی۔ آج کل چور بھی اسی تاک میں ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا سی بے پروائی کرے اور چور اپنا کام دکھا جائے۔“ جمیل نے لاابالی انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟ میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔“ وحید نے کہا۔

جمیل بولا: ”تم گھر کو باہر سے تالا لگا کر نماز پڑھنے نہیں گئے اور چور کو موقع مل گیا۔“

”تالا لگا کر ہی جاتا ہوں۔ ان دو دنوں میں بھی تالا لگا کر ہی گیا تھا۔“ وحید نے جواب دیا۔

جمیل کچھ سوچتے ہوئے بولا: ”پھر تو چور کو پکڑنا بہت مشکل ہے، بہر حال میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تمہارا چور پکڑا جائے۔“ یہ کہہ کر جمیل آگے بڑھ گیا۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وحید نے ایک روز صبح مسجد جاتے ہوئے اپنے مالک مکان کے نوجوان بیٹے سلمان کو دیکھا جو گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ وحید کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور وحید کے پیچھے پیچھے مسجد چلا آیا۔

جب سلمان مسجد کے واش روم میں گیا تو وحید کو شک ہوا کہ کہیں سلمان ہی وہ چور نہ ہو۔ یہ سوچتے ہوئے وحید وضو خانے کی طرف جانے کے بجائے امام صاحب کے کمرے میں جا کر کھڑکی سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد سلمان واش روم سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھ کر باہر چلا گیا۔ وحید بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے تھے۔ سلمان ان کے گھر کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ وحید بھی پیچھے پہنچ گئے اور کرخت لہجے میں کہا: ”اچھا، تو وہ چور تم ہو! ابھی تمہیں اس حرکت کا مزہ چکھاتا ہوں۔“

”کیا مطلب انکل! میں سمجھا نہیں۔“ سلمان انجان بننے لگا۔

وحید نے کہا: ”تم نے میرے گھر چوری کی! جلدی بتاؤ کہ میرا موبائل فون اور چار ہزار روپے کہاں ہیں؟“

لیکن سلمان کسی طور نہیں مانا تو وحید کہنے لگے: ”تم ایسے نہیں مانو گے، میں ابھی 15 پر فون کر کے پولیس کو بلاتا ہوں۔“

وحید کا یہ کہنا تھا کہ سلمان گھبرا کر رو پڑا: ”پلیز انکل! آپ پولیس کو نہ بلائیں۔ میں دونوں چیزیں آپ کو واپس کر دوں گا۔“

پھر سلمان اندر گھر میں گیا اور موبائل فون اور چار ہزار روپے لا کر وحید کو دیتے ہوئے کہا: ”انکل! یہ لیں پیسے اور موبائل لیکن پلیز میرے ابو کو نہیں بتائیے گا، وہ مجھے بہت ماریں گے۔ اور کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیجیے گا ورنہ ابو کی بہت بدنامی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، مگر میری ایک شرط ہے۔“ وحید نے کہا۔

”انکل! مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے۔“ سلمان شرمندگی سے بولا۔

”وحید نے کہا: ”میں گھر کو روز تالا لگا کر جاتا ہوں، تم نے تالا کیسے کھولا؟ دوسرے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرو گے۔“

سلمان نے کہا: ”انکل! آپ ہمارے کرایہ دار ہیں اور آپ کے گھر کے دروازے میں لگا ہوا تالا بھی ہمارا ہے۔ اس کی دوسری چابی ہمارے پاس ہے۔ اب آپ نیا تالا لا کر لگا دیں۔ اور میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔“

یہ سن کر وحید نے سلمان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: ”شاباش! اگر صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ n

ایان اور اصفان

عثمان اکرم۔ ملتان

کلاس میں بیٹھے اصفان نے ایان سے کہا: ”ایان! تمہارے انگریزی میں بہت کم نمبر آئے ہیں۔ کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے، بس آج کل پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے ہر وقت ٹی وی دیکھتا رہوں۔“ ایان نے جواب دیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم ایک دو دن کی چھٹی لو اور گھر پر آرام کرو۔“ اصفان نے ہمدردی سے اصفان کو مشورہ دیا۔

چناں چہ ایان نے سر رمضان سے دو دن کی چھٹی لی اور دونوں دوست گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایان شہر کے ایک رئیس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اصفان غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اصفان کے والدین چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح اصفان کو شہر کے اچھے اسکول میں تعلیم دلوا رہے تھے۔ وہ تھا بھی بہت ذہین، ہر امتحان میں فرسٹ پوزیشن لاتا تھا۔ دوسری جانب ایان بھی پڑھائی میں اس سے کم نہیں تھا، مگر کچھ دنوں سے وہ برے دوستوں کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا جس کا اس پر برا اثر پڑا۔

اس روز کلاس میں سر رمضان نے اصفان سے پوچھا: ”ایان کہاں ہے؟ اس نے دو دن کی چھٹی لی تھی، مگر پورا ایک ہفتہ گزر گیا ہے، اس کا کوئی پتا نہیں۔“

اصفان نے جواب دیا: ”سر! میں خود نہیں جانتا۔ آج چھٹی کے بعد میں اس کے گھر جاؤں گا۔“

چھٹی کے بعد اصفان سیدھا ایان کے گھر گیا۔ ایان نے خود ہی گھر کا دروازہ کھولا۔ اصفان اسے دیکھ کر چونکا، کیوں کہ وہ بہ ظاہر بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔

اسے دیکھ کر ایان نے جلدی سے کہا: ”آؤ، اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

دونوں اندر چلے گئے۔ ایان نے اپنے ملازم کو کافی اور بسکٹ لانے کو کہا اور اصفان سے باتیں کرنے لگا۔

اصفان نے ایان سے کہا: ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، پھر تم اسکول کیوں نہیں آ رہے؟“ اتنے میں ملازم کافی اور بسکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ایان نے کہا: ”یہ سب باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی، پہلے تم کچھ کھا پی لو۔“

اصفان نے تھوڑی سی کافی پی اور کہا: ”اب بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے۔“

”میرا اب پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔“ ایان نے کہا: ”بس نئے نئے کپڑے پہن کر گھومنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو تم اچھا بھلا پڑھتے تھے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ برہان سے بچو، وہ اچھا لڑکا نہیں ہے، مگر تم نہ مانے اور اب تم بھی اس جیسے بن گئے ہو۔“ اصفان کے لہجے میں افسوس تھا۔

کچھ دیر ایان سوچتا رہا، پھر اس نے کہا: ”مجھ سے برہان نے کہا تھا کہ تمہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، خدا کا دیا سب کچھ تو ہے تمہارے پاس، سب چھوڑو اور شہزادے کی سی زندگی گزارو۔ اس کی بات مجھے اچھی لگی، یہ سب یہ ساری دولت میری ہی تو ہے۔“

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ یکا یک ایان کے ابو آ گئے۔ وہ اپنے بیٹے کے بدلے ہوئے رویے کو پہلے ہی دیکھ رہے تھے اور پھر اس وقت انہوں نے اس کی باتیں بھی سن لی تھیں۔

انہوں نے اسے پیار سے سمجھایا: ”میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے، لیکن اگر تم پڑھو گے اور خوب علم حاصل کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کو علم کے فوائد بتائے، مگر ایان ان کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا گیا۔ اس کے ابو اس کی عدم دلچسپی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اصفان سے کہا: ”بیٹا! تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ۔“

اس سے پہلے کہ اصفان کچھ کہتا، ایان نے جلدی سے کہا: ”بھئی تم شروع مت ہو جانا، میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا ناں کہ میں اسکول نہیں جاؤں گا تو نہیں جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر ایان اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اصفان اپنے گھر واپس آ گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ تعلیم کے بعد اصفان کو ایک بڑی کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کی طرف سے اصفان کو گھر اور گاڑی بھی ملی تھی۔ اب اصفان شان دار زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں ایک بھکاری اس کی کار کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اصفان نے بھکاری کو غور سے دیکھا تو اچھل پڑا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کا دوست ایان تھا۔ اصفان، ایان کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اسے کھلایا پلایا، نہلوایا، لباس بدلوایا اور حال چال پوچھا تو ایان نے کہا: ”چند سال قبل میرے والد کی وفات ہو گئی جس کے بعد میں نے بنگلہ اور گاڑی بیچ دی اور سب پیسے بھی اڑا دیے۔ اب میں بھیک مانگ کر گزارا کرتا ہوں۔ مجھے اپنے غرور کی سزا مل چکی ہے۔“

یہ سن کر اصفان کو افسوس تو ہوا، مگر اس نے اپنے دوست ایان کو کوئی نصیحت کرنے یا اس پر طنز کرنے کے بجائے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے اپنے دفتر میں ملازمت دلوا دی۔ n

اعظم کا کارنامہ

محمد علیم نظامی۔ لاہور

کسی گاؤں میں ایک بہادر لڑکا اعظم رہتا تھا۔ اس کا باپ فرمان ایک زمین دار تھا اور بہت سی زمینوں کا مالک تھا۔ اعظم بہت رحم دل تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اعظم کی عزت کرتے تھے۔ اس کی رحم دلی اور ہمدردی کی وجہ سے لوگ اسے "بادشاہ" کہتے تھے۔ اعظم غریبوں کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ یہ گاؤں اچھا خاصا خوش حال تھا۔ گاؤں کے قریب ایک جنگل بھی تھا جو مختلف جانوروں کا مسکن تھا۔

ایک روز اعظم اپنے باپ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے ہانپتے کانپتے بڑی مشکل سے بتایا: "فرمان صاحب! تھوڑی دیر پہلے جنگل سے ایک خوف ناک درندہ ہمارے گاؤں میں آیا اور ایک بکری کو لے گیا ہے۔"

اس کے بعد ہر روز کوئی نہ کوئی گاؤں والا اس درندے کی شکایت لے کر آنے لگا اور وہ گاؤں جو امن کا گہوارہ تھا، اب اس میں بدامنی پھیلنے لگی۔ زمین دار فرمان علی اس صورت حال پر بہت پریشان تھا۔ جب بادشاہ کو پتا چلا تو اس نے اسی وقت گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا: "تم لوگ فکر مت کرو، میں جلد ہی اس درندے کا بندوبست کر دوں گا۔"

اس کے بعد اعظم نے اپنے ساتھ کچھ سامان لیا اور گھر سے باہر آ گیا۔ جس راستے سے درندہ گزر کر گاؤں جاتا تھا، اعظم نے بھی اس راستے پر اپنا ڈیرا جما لیا۔

اگلی شام جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے اس وقت اعظم کو جنگل کی طرف سے ایک سایہ آگے بڑھتا نظر آیا۔ اس نے غور کیا تو پتا چلا کہ یہ وہی درندہ تھا جس نے گاؤں میں تباہی پھیلا رکھی تھی۔ اس درندے کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اعظم نے اپنا تیر کمان سنبھالا اور نشانہ لے کر بے ہوشی کی دوا والا تیر چھوڑا۔ چند سیکنڈ بعد زوردار چنگھاڑ کی آواز آئی، پہلے تو درندہ چند قدم چلا مگر پھر لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

اعظم نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسری جانب گاؤں کے لوگ بھی اس درندے کی چنگھاڑنے کی آواز سن چکے تھے اور اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ جب انھوں نے درندے کو بے ہوش پڑے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اسے فوراً پنجرے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد اعظم نے وائلڈ لائف والوں کو پیغام بھیجا کہ انھوں نے ایک نایاب درندہ پکڑا ہے، آ کر لے جائیں۔

وائلڈ لائف والوں کی ٹیم فوراً گاؤں پہنچی اور اس درندے کو اپنی گاڑی پر بنے پنجرے میں ڈال دیا۔ شہر جانے سے پہلے ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر عاشق نے اعظم کو شاباشی دیتے ہوئے کہا: "آج تمھاری عقل مندی اور بہادری کی وجہ سے ایک قیمتی درندے کو زندہ پکڑ لیا گیا ہے، اگر تم اسے مار دیتے تو یہ جنگلی حیات کا بڑا نقصان ہوتا۔ بہر حال اب اس کی نسل کو بچا کر محفوظ کر لیا گیا ہے۔"

گاؤں والے ڈاکٹر عاشق کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے اور ان کے دل میں اعظم کی عزت بڑھ گئی اور وہ سب اس کی بہادری اور عقل مندی کی تعریف کرنے لگے۔ n

بابا شیرو کا باغ

وقاص اسلم کمبوہ

راج پورہ ایک خوب صورت اور پر سکون گاؤں تھا جس میں شفاف پانی کی ایک ندی بہتی تھی۔ گاؤں کے خوب صورت باغ کی دیکھ بھال بابا شیر خان کرتا تھا جو اب کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔

ماضی میں وہ ایک اسکول میں کلرک تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد اسی باغ کا ہو کر رہ گیا تھا۔ بابا شیر خان کو بچپن سے باغ بانی کا شوق تھا، حالاں کہ اسے اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا، بس یہ شیر خان کا اپنا جنون تھا۔ سارا گاؤں اسے بابا جی کہتا تھا۔

شام کو گاؤں والے وہاں آتے اور بچے بھی کھیلتے کودتے تھے۔ بابا جی انہیں اچھی کہانیاں سناتے تھے۔ وہ بچوں کو ہمیشہ پھولوں اور پودوں کے بارے میں بتاتے اور انہیں نہ توڑنے کی نصیحت کرتے تھے۔ بابا جی کے باغ کے درختوں پر بہت سے پرندے گھونسلوں میں رہتے تھے۔ اکثر گاؤں کے پڑھے لکھے لوگ صبح بابا شیر خان کے باغ کی طرف آنکلتے جہاں وہ گھاس پر چہل قدمی کرتے تھے۔ کبھی کبھار بابا کے بیٹے بھی اپنے بچوں سمیت ادھر آجاتے جنہیں دیکھ کر بابا جی کا دل اور بھی خوش ہوتا تھا۔

بابا شیرو اب بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔ آخر کار بابا جی ایک روز اس ہرے بھرے باغ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چل بسے۔ ان کی موت کے بعد کچھ دن تک تو گاؤں والوں نے اور بابا جی کے بیٹوں نے باغ کی دیکھ بھال کی، مگر پھر آہستہ آہستہ منہ موڑ لیا۔ کچھ دن بعد گاؤں والوں نے وہاں جانور باندھنے شروع کر دیے اور کوڑا کرکٹ بھی وہیں پھینکنے لگے۔ پھول اور پودے بھی مرجھا گئے۔ درخت بھی پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گئے۔ جب پرندوں نے یہ سب دیکھا تو وہ بھی وہاں سے جانے لگے۔

☆☆

اس دن فلاور ڈے یا پھولوں کا دن منایا جا رہا تھا۔ فریال اور فرمان کے اسکول میں بھی یہ دن منایا جاتا تھا، اس لیے وہ بھی بہت پر جوش تھے۔ انہوں نے بھی اسکول کے گراؤنڈ میں اپنے ہاتھ سے ایک ایک پودا لگایا۔ اس موقع پر ان کی ٹیچروں نے بچوں کو پھولوں اور پودوں کی اہمیت سے آگاہ کیا اور سب بچوں کو نصیحت کی زیادہ پھول پودے لگائیں اور اس دنیا کو خوب صورت بنائیں۔

فریال اور فرمان نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے گاؤں کے اس باغ کو دوبارہ سرسبز کریں گے جو بابا جی کی وفات کے بعد خشک ہو چکا ہے۔ جب انہوں نے اپنے دوستوں سے یہ بات کی تو سبھی بابا جی کے باغ کو نئی زندگی دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

پہلے سب بچوں نے مل جل کر اس باغ کی صفائی کی۔ پھر اپنے بڑوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کر وہاں نئے پودے اور درخت لگائے۔

کئی ماہ کی مسلسل محنت کے بعد بابا جی کا باغ ایک بار پھر ہرا بھرا ہو گیا۔n



دل کے اچھے شرارتی بچے

آزمیر طارق......کراچی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا رہتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے، دونوں لڑکے بے حد شرارتی تھے۔ گھر اور اسکول ہر جگہ ان کی شرارتیں مشہور تھیں۔ لکڑہارا دونوں کو سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا، مگر دونوں بچے اپنے ابو کی بات ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ آخر تھک ہار کر ان کے ابو نے دونوں کے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی۔

ایک طرف ابو نے غصے میں پابندی لگائی تو دوسری طرف ان کی اماں تھیں، جو بے حد رحم دل اور پیاری تھیں۔ جیسے ہی ابو لکڑیاں کاٹنے کے لئے باہر جاتے، دونوں بھائی اپنی اماں کو پیار سے منا کر باہر جانے کی اجازت حاصل کر لیتے۔ گھر سے نکلتے اور خوب کھیلتے کودتے۔

ایک دن وہ دونوں ہمیشہ کی طرح گھر سے کھیلنے نکلے کہ اچانک راستے میں انہیں ایک زخمی چڑیا ملی۔ چھوٹی سی چڑیا بری طرح زخمی تھی اور چوٹ لگنے کی وجہ سے اڑ بھی نہ پارہی تھی۔ دونوں بھائیوں نے بھولی بھالی چڑیا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں گھر کی جانب دوڑے، ایک نے مرہم اٹھایا تو دوسرے نے پانی کا کٹورا ہاتھ میں تھام لیا۔ واپس آئے تو چڑیا ویسے ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ پانی کا کٹورا دیکھ کر اس نے تھوڑی حرکت کی اور جلدی جلدی پانی پینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت دیر سے پیاسی ہو۔ جب چڑیا پانی پی چکی تو دونوں بچوں نے آہستہ آہستہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اسے مرہم لگانا شروع کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چڑیا کے پیروں میں ایک لوہے کا باریک تار پھنسا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ اڑ نہیں پارہی۔ دونوں نے نرمی سے تار سے چڑیا کے پیر آزاد کرائے اور مرہم لگا کر دعا کرنے لگے کہ خدا چڑیا کو شفا دے۔ پانی پینے اور مرہم لگانے کے بعد چڑیا کافی بہتر حالت میں نظر آرہی تھی اور تھوڑی دیر بعد تو وہ اڑنے بھی لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے اڑ کر قریبی درخت پر موجود اپنے گھونسلے میں پہنچ گئی۔ دونوں بھائی چڑیا کو دوبارہ اڑتا دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ابھی وہ تالیاں بجا ہی رہے تھے کہ ان کی نظر اپنے ابو پر پڑی، جو تھوڑے فاصلے پر اپنی لکڑیوں کے ساتھ کھڑے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں بچے ڈر گئے کہ ابو کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے پر ابو انہیں بہت ڈانٹنے والے ہیں۔ ابو آہستہ آہستہ ان کی طرف آرہے تھے۔ جیسے ہی وہ قریب آئے، انہوں نے مسکرا کر اپنے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچے حیران تھے کہ ہمیشہ ان کی من مانیوں سے تنگ ہونے والے ابو آج خوش کیوں ہیں لیکن ابو نے بول کر ان کی پریشانی کا جواب پیش کر دیا۔ ابو بولے۔ ''بچو! آج تم میری اجازت کے بغیر گھر سے نکلے، مگر ایک زخمی چڑیا کی مدد کرنے پر میں آپ کی نافرمانی نظر انداز کر رہا ہوں۔ نیکی کے کام اور دوسروں کی مدد کرنے والے بچوں کو سزا دینا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ میں خوش ہوں کہ شرارتی ہونے کے باوجود آپ دونوں نیک دل بچے ہیں۔'' بچے ابو کی جانب سے اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئے اور آئندہ اپنے ابو کو تنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ کبھی اپنے والدین کی نافرمانی نہ کریں گے کیونکہ یہ بھی ایک نیکی ہے۔

بدروح والی جھیل

مرزا ظفر بیگ

فرحان کو شروع سے ہی قدرتی مناظر بہت پسند تھے۔اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی گاؤں کی سیر کرے اور وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہو۔ فرحان کا ایک دوست باسط گاؤں کا رہنے والا تھا۔ویسے تو وہ شہر میں پڑھتا تھا، مگر اس کا گھر گاؤں میں تھا۔ فرحان نے جب باسط کو بتایا کہ وہ گاؤں دیکھنا چاہتا ہے تو باسط نے اسے چھٹیوں میں اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دی۔ اپنے امی ابو سے اجازت لینے کے بعد فرحان اپنے دوست باسط کے گاؤں روانہ ہو گیا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی فرحان خوش ہو گیا۔وہاں کا قدرتی ماحول، صاف ستھری آب و ہوا اور شادابی اسے اتنی پسند آئی کہ فرحان نے کافی دیر تک وہاں تازہ ہوا میں کھڑے ہو کر گہرے گہرے سانس لیے۔

گاؤں میں باسط کا گھر چھوٹا، مگر صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ فرحان کو یہ گھر بہت پسند آیا۔وہ روزانہ کھیتوں میں نکل جاتا اور وہاں جی بھر کر چہل قدمی کرتا تھا۔گاؤں کے میدانوں اور کھیتوں میں اسے قسم قسم کے پرندے دکھائے دیتے تھے جنھیں دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو جاتی۔

پہلے ہی روز باسط، فرحان کو اپنے ساتھ دریا پر لے گیا جہاں وہ دونوں جی بھر کر نہائے۔باسط نے اپنے دوست فرحان کو اپنے گاؤں کے دیگر دوستوں سے بھی ملوایا۔وہ سبھی بہت اچھے اور خوش مزاج تھے۔اسی سہ پہر کو ان سب لڑکوں نے دو ٹیمیں بنائیں اور فٹ بال کھیلی جس میں انہیں بڑا مزہ آیا۔جس میدان میں یہ لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے، اس کے بالکل ساتھ ہی ایک جھیل بھی واقع تھی۔

میچ شروع ہونے سے پہلے باسط نے فرحان کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا: ''فرحان! اس جھیل کے قریب جانے کی کوشش بھی نہ کرنا، کیوں کہ اس پر بدروحوں کا قبضہ ہے۔وہ اپنے علاقے میں آنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتیں۔''

فرحان نے باسط کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور مذاق اڑانے والے انداز میں کہا: ''بدروح! وہ کیا ہوتی ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ اس جھیل پر کس بدروح نے قبضہ کر رکھا ہے، تم دیکھنا، میں اس سے دو دو ہاتھ کر کے رہوں گا۔''

فرحان کی بات سن کر باسط کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ مگر وہ خاموش رہا۔وہ جانتا تھا کہ اس کا دوست کتنا ضدی ہے۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فرحان بدروحوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا۔

دونوں ٹیموں کے درمیان میچ جاری تھا، انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ جھیل کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔اسی دوران ایک لڑکے نے فٹ بال کو کک ماری تو بال اڑتی ہوئی جھیل کے بیچوں بیچ جا گری۔

اب تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ جھیل میں کود کر بال لاتا۔فرحان نے جب یہ دیکھا کہ بال جھیل کے پانی میں ڈوب رہی ہے تو اس نے سوچے سمجھے بغیر جھیل میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا بال کی طرف بڑھا جو پانی کے اندر جا چکی تھی۔جھیل کے بیچ میں پہنچ کر فرحان نے سانس روکا اور پانی میں غوطہ مارا، مگر بال نظر نہ آئی۔ جب اس کے لیے مزید سانس روکنا ممکن نہیں رہا تو اس نے سطح پر آنے کا فیصلہ کیا، لیکن جیسے ہی وہ اوپر کی طرف اٹھا تو کسی چیز نے اس کی قمیص کو پکڑ لیا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو پتا چلا کہ اس کی قمیص ایک کانٹے دار جھاڑی میں پھنس گئی ہے۔

دوسری طرف جھیل کے کنارے پر سب لڑکے اس کے منتظر تھے۔وہ سبھی پریشان تھے اور باسط تو رونے لگا تھا۔ فرحان کو جھیل کے اندر گئے تین منٹ ہونے والے تھے۔سب کا خیال تھا کہ جھیل کی بدروح نے فرحان کو پکڑ لیا ہے۔

فرحان نے کانٹے دار جھاڑی سے اپنی قمیص چھڑائی اور تیزی سے تیرتا ہوا اوپر سطح پر پہنچا تو لڑکوں کی جان میں جان آئی۔ مگر فرحان کی آنکھیں بالکل لال ہو رہی تھیں۔وہ تیرتا ہوا کنارے پہنچا تو باسط نے کہا: ''خدا کا شکر ہے کہ تم صحیح سلامت لوٹ آئے۔''

فرحان نے ہنستے ہوئے کہا: ''یہ جھیل کانٹے دار جھاڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ہماری بال اسی میں پھنس گئی تھی۔ یہاں نہ کوئی بدروح ہے اور نہ بھوت۔دوسری بال منگواؤ اور کھیل شروع کرو۔''

''مگر تمہاری آنکھیں لال کیوں ہو گئیں؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''میں نے دو منٹ سے زیادہ عرصے تک سانس روکا تھا، اس سے میری آنکھیں لال ہو گئیں۔'' فرحان نے جواب دیا۔

گاؤں کی اس یادگار سیر کے بعد فرحان اپنے گھر واپس لوٹ آیا، مگر گاؤں کے لوگ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ اس جھیل میں بدروح رہتی ہے۔n

بدروح

ماہم سید۔ فیصل آباد

یہ واقعہ اسلم کے بھائی عمر کے ساتھ 1970ء میں پیش آیا تھا۔اس وقت عمر کی عمر پندرہ برس تھی۔یہ لوگ لائنزایریا میں رہتے تھے اور آج بھی وہیں رہتے ہیں۔ایک باراتوار کو عمر اپنے کسی دوست سے مل کر اپنی گاڑی میں واپس گھر آرہا تھا۔اسے کافی دیر ہو گئی تھی،شاید ایک بج چکا تھا۔اسی دوران راستے میں عمر کی گاڑی خراب ہو گئی،شاید اس کی گاڑی کے نیچے کوئی چیز آگئی تھی۔وہ گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی گاڑی کے نیچے کچھ نہیں تھااور پھر اچانک اس کی گاڑی بھی اسٹارٹ ہو گئی۔بہر حال عمر اپنے گھر آگیا،اس وقت تک رات کے دو بج چکے تھے۔تھکا ہوا تو تھا ہی،بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

جب صبح ہوئی تو عمر کا بھائی اسلم اسے جگانے آیا،مگر عمر بہت گہری نیند میں تھا۔اسلم نے زبردستی اسے اٹھایا تو عمر کو غصہ آگیااور اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا جس کے بعد اس کی طبعیت مسلسل بگڑتی چلی گئی،کیوں کہ عمر کو کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تھی۔عمر کے گھر والے اسے پاگل سمجھنے لگے تھے۔

اسی دوران ایک روز وہاں سے کسی بزرگ کا گزر ہوا۔انھوں نے عمر کو دیکھااور اس کے گھر والوں سے کہا:”اس بچے پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔میرے جاننے والے ایک مولوی صاحب ہیں۔
میں انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“

غرض مولوی صاحب آئے اور انہوں نے عمر کے پاس بیٹھ کر قرآنی آیات پڑھیں اور اس پر دم کیا۔پھر عمر کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:”تم کون ہو اور اس بچے کے پیچھے کیوں پڑی ہو؟“

بدروح نے جواب دیا:”رات کے وقت اس لڑکے نے میرے بچے کو اپنی گاڑی سے کچل دیااور وہ مر گیا۔میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

مولوی صاحب نے کہا:”جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا،تمہیں اسے چھوڑنا ہو گا۔مجھے یہ بتاؤ کہ اسے چھوڑو گی یا نہیں؟“

بدروح نے کہا:”ٹھیک ہے،میں اسے چھوڑدوں گی،مگر اس سے کہہ دو کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے ورنہ میں چھوڑوں گی نہیں۔“اس کے بعد وہ بدروح وہاں سے چلی گئی۔n

بادشاہ کا فیصلہ

محمد علیم نظامی۔ لاہور

ایک تھا بادشاہ، بڑا نیک دل! اس کی مملکت کا ہر شخص خوش حال تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ جیل کا معائنہ کرنے گیا تو اس نے وہاں موجود قیدیوں سے بھی کچھ باتیں کیں اور ان سے ان کے حالات پوچھے۔

پہلے قیدی نے بادشاہ کو بتایا کہ مجھے آپ کے سپاہی چوری کے الزام میں پکڑ لائے تھے، مگر میں بے قصور ہوں۔ دوسرے قیدی نے بھی اپنے آپ کو بے قصور بتایا۔ غرض بادشاہ نے جس قیدی سے بھی اس کے بارے میں پوچھا ، ہر ایک نے خود کو بے قصور بتایا۔ بادشاہ ہر قیدی کی بات سن کر مسکراتا رہا۔ اچانک اس کی نظر ایک قیدی پر پڑی جو ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے اس قیدی سے بھی یہی سوال کیا کہ تم کس جرم میں یہاں قید ہو؟

اس قیدی نے جواب دیا: "بادشاہ سلامت! میں بہت گناہ گار ہوں۔ میرے گناہوں نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں کسی کو اپنا منہ دکھا سکوں۔ میں ایک اچھا آدمی تھا۔ ہمیشہ ایمان داری سے کام کرتا تھا۔ ایک بار مجھے شیطان نے بہکا دیا اور میں نے ایک آدمی کے پیسے چرا لیے جس کے نتیجے میں مجھے جیل میں ڈال دیا گیا۔"

بادشاہ نے یہ جواب سن کر سوچا کہ یہاں ہر کوئی اپنے آپ کو بے قصور بتا رہا ہے۔ یقیناً ان میں سب بے قصور نہیں ہو سکتے۔ اگر میں نے انھیں رہا کیا تو یہ ملک میں بدامنی پھیلائیں گے۔ جب کہ اس آدمی نے اپنی زبان سے اپنے آپ کو گناہ گار تسلیم کیا ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ بھی ہے۔ اگر میں نے اسے رہا نہ کیا تو یہ دوبارہ اس راستے پر آ جائے گا۔ یہ سوچ کر بادشاہ نے اس قیدی کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد بادشاہ جیل سے چلا گیا اور سب باتیں بھول گیا۔

کچھ عرصے بعد بادشاہ پھر جیل کا معائنہ کرنے گیا اور سب قیدیوں سے باتیں کیں۔ اس مرتبہ قیدیوں نے بادشاہ سلامت کو اپنے اپنے گناہوں کی تفصیل بڑے فخر کے ساتھ بتائی۔ بادشاہ سب کی باتیں سنتا رہا، پھر جاتے ہوئے اس نے سپاہیوں سے کہا: "یہ سب قیدی قصوروار ہیں اور اپنے گناہوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے ان کی تفصیل مزے سے سنا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان پر جیل میں قید رہنے کا کوئی اثر نہیں ہوا لہٰذا ان سب کی قید کی مدت بڑھا دی جائے۔" یہ حکم سنا کر بادشاہ سب قیدیوں کو ہکا بکا چھوڑ کر چلا گیا۔ ☆

بنٹو کی لکھی کہانی

ثناء اکرم۔ سرگودھا

بھیا کالج سے لوٹے تو بنٹو کو ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ حیرت کی وجہ بنٹو کی موجودگی نہیں، بلکہ اس کے ہاتھ میں قلم اور کاپی کا ہونا تھا۔

"کیا بات ہے بنٹو میاں؟ بڑے سنجیدہ نظر آ رہے ہو؟" بھیا نے طنزیہ انداز سے پوچھا، مگر چوں کہ بنٹو بہت مصروف تھے، اس لیے کوئی کرارا جواب نہ دیا، بلکہ مدھم لہجے میں کہا: "میں دراصل کہانی لکھ رہا ہوں۔"

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ کہانی لکھ رہا ہوں۔" بنٹو نے کسی بہت ہی عظیم ادیب کی طرح جواب دیا۔

"چھوڑو بھی، کیوں مذاق کر رہے ہو؟ اچھا بتاؤ کتنی لکھی ہے؟"

"کہانی ملے تو لکھوں نا، ابھی تو ڈھونڈ ہی رہا ہوں۔" بنٹو نے پریشانی سے جواب دیا۔

"کہانی ڈھونڈی نہیں جاتی، دماغ سے سوچ کر لکھی جاتی ہے۔" بھیا نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں، کہانی تو میں آج ڈھونڈ کے ہی رہوں گا۔"

"اچھا! پھر ذرا مجھے بھی کہانی ڈھونڈنے والا طریقہ بتاؤ۔"

یہ سنتے ہی بنٹو نے سارے رسائل چھوڑے اور کسی کامیاب پروفیسر کی طرح کہا: "ابھی سمجھاتا ہوں۔"

بھیا بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، تاکہ ان حکمت ودانش کے موتیوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

"سب سے پہلے تو کہانیوں والے ڈھیروں رسالے منگوائیں۔ پھر ان سب کو غور سے پڑھیں۔ اگر آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں، تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

بنٹو کی اس بات پر بھیا کی ہنسی چھوٹ گئی، مگر بنٹو سنجیدہ تھے: "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان رسائل کو غور سے پڑھیں اور ان میں سے چن چن کے چند بہترین کہانیاں نکال لیں۔ پھر ان میں سے دو دو لائنیں الگ الگ کر کے ایک سادہ صفحے پہ لکھ لیں، تھوڑے سے جوڑ توڑ کے بعد آپ کی کہانی تیار! اس طرح آپ اپنی ذاتی محنت کی بدولت ایک شاندار کہانی لکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" کچھ دیر رکنے کے بعد بنٹو نے پھر کہا: "اس کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کہانی کو ایک تگڑی سی فون کال کے ساتھ ایڈیٹر کی خدمت میں پیش کریں اور پھر دیکھیں کہ کس اعزاز کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔" بنٹو یوں خوش ہوتے ہوئے بولے جیسے واقع کہانی شائع ہو گئی ہو۔

"پھر وہ کہانی تو نہ ہوئی، بلکہ کہانیوں کا سلاد ہو گیا اور ایسے بدمزہ سلاد کے لیے چاہے کتنے ہی فون کیے جائیں، اس کا مقدر ردی کی ٹوکری ہی ٹھہرتی ہے۔"

بھیا تو یہ کہہ کر چلے بنے، مگر بنٹو کی سوئی تو سلاد پر ہی اٹک گئی، کیوں کہ کھانے والی چیز کا نام سن کر اس کے معدے نے اچھل کود شروع کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کے اور معدے کے درمیان تیسری عالمی جنگ چھڑتی، اس نے نامور ادیب بننے کا ارادہ ترک کیا اور سیدھا کچن میں پہنچ گیا۔ n

بارش ایک نعمت

اشفاق قادر سنگی۔ پنڈ سلطانی (اٹک)

دو تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اس دوران ایک بار بھی بارش نے رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر علی نے اپنی امی جان سے کہا: ''امی جان! یہ تو بتایئے کہ بارش روزانہ کیوں ہوتی ہے، وہ بھی اتنی تیز کہ ہم ہر روز جب اسکول پہنچتے ہیں تو ہمارا یونیفارم اور اسکول بیگ سب بھیگ جاتے ہیں۔ اسکول میں بارش کی وجہ سے سارا دن باہر نہیں نکل پاتے، بلکہ کلاس روم میں ہی بند رہتے ہیں۔ پھر جب شام کو گھر پہنچتے ہیں تو بھی باہر نہیں نکل پاتے، بلکہ گھر میں ہی قید ہو جاتے ہیں۔ اس بارش کی وجہ سے ہمیں کھیلنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا!''

علی کی یہ بات سن کر اس کی امی جان نے جواب دیا: ''بیٹا! بارش اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر بارش نہ ہو تو ہماری زمین کا یہ سارا انظام زندگی گڑبڑ ہو جائے، کیوں کہ پانی تمام جان داروں کی زندگی کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کرۂ ارض پر بارش کی وجہ سے ہی بہار ہے۔ بارش کی وجہ سے ہمارے ندی، نالے اور دریا بھر جاتے ہیں اور ان میں پانی کی ہر طرح کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں کھیتی باڑی میں بھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری تمام فصلوں اور باغات کے لیے بھی پانی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر نہ کوئی فصل اگ سکتی ہے اور نہ باغات پھل دے سکتے ہیں۔ بارش کی وجہ سے فصلیں بہت اچھی اور ہری بھری ہوتی ہیں جو ہمارے لیے خوراک کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ زمین پر رہنے والے تمام جان داروں کے لیے بھی تو ہوا بہت ضروری ہے۔ پھر بارش صفائی کا کام کرتی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے فضا دھل دھلا کر نکھر جاتی ہے اور ہوا میں موجود تمام آلودگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بارش کے پانی کی وجہ سے درختوں کے پتے ہوا میں نہا دھو کر تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ درخت بہت صاف ستھری آکسیجن پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے تمام چھوٹی موٹی بیماریاں جیسے نزلہ، زکام اور گلے کی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔''

امی جان کی باتیں سن کر علی بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد وہ ناشتہ کر کے اسکول چلا گیا۔ مگر راستے میں اس نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے اسکول اور کلاس کے تمام بچوں کو بارش کے فائدے بتائے گا، تاکہ بارش سے گھبرانے اور پریشان ہونے والے بچے بھی خوش ہوں۔ ■

برکتوں والا مہینہ

عظمیٰ مبین۔ کراچی

رمضان کا برکتوں والا مہینہ آگیا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کے لیے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رجب و شعبان سے ہی یہ دعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! تو ہمیں رجب و شعبان میں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان میں پہنچا دے۔''

یہ وہ برکت والا مہینہ ہے جس میں نبی کریمؐ خوب سخاوتیں بھی کرتے تھے اور جی بھر کر عبادت بھی فرماتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ رمضان کے مہینے میں غلاموں کو آزادی عطا فرماتے اور کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے۔

رمضان کے روزوں کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ روزے آخرت میں دوزخ سے ڈھال بنیں گے اور اللہ کے حضور روزے دار کی بخشش کی سفارش کریں گے اور اللہ ان کی سفارش قبول فرمائے گا۔ اگر رمضان میں خاص ثواب کی نیت سے روزے رکھے جائیں اور اس کی راتوں میں قیام (تراویح) کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

رمضان کی برکتوں کا یہ عالم ہے کہ اس مہینے میں ہر نفل عبادت کا ثواب فرض عبادت کے برابر اور ہر فرض عبادت کا ثواب سات سو گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

اگر ہم ایک سال کے 365 دنوں میں سے صرف 30 دن اللہ کی رضا کے لیے رمضان کے روزے رکھیں اور رات میں قرآن کی تلاوت کریں تو یہی روزہ اور تلاوت ہمیں دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جانے کی ضمانت بن جائیں گے۔ اللہ پاک اس مہینے میں لوگوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔ یہ سلسلہ پورے رمضان چلتا رہتا ہے۔ اس ماہ کی پہلی رات کو شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اللہ کے نیک اور فرماں بردار بندوں سے اس بابرکت مہینے میں نافرمانی نہ کروائیں۔ روزہ دار اپنے رب کی رضا کی خاطر دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے اور جھوٹ، لڑائی، غیبت، چوری اور اس طرح کے دیگر گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اس کے لیے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں اسے آخرت میں اتنا اجر دوں گا کہ وہ شخص خوش ہو جائے گا۔

اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر اس مہینے کا کوئی روزہ چھوڑ دیا تو اگر وہ پورے سال بھی روزے رکھے تو وہ رمضان کے ایک روزے کے ثواب کے برابر نہیں پہنچ سکتے۔ آیئے ہم سب مل کر یہ دعا کریں کہ جن بچوں کی روزہ رکھنے کی عمر ہے، وہ رمضان کے اس مہینے میں پورے روزے رکھیں اور جو ابھی کم عمر ہیں، وہ بھی اس مہینے کا احترام کریں، تاکہ جب بڑے ہو کر وہ بھی روزے رکھنے لگیں تو انہیں اس کی پہلے سے عادت ہو۔ ■

بے مثال دوست

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

حامد کے ابو نے اینٹیں بنانے والے بھٹے کے قریب گاڑی روکی جہاں اینٹیں تیار کی جارہی تھیں۔ حامد کے ابو اس بھٹے کے مالک کے دوست تھے۔ وہ ان سے کچھ ضروری باتیں کر رہے تھے اور حامد وہاں تیار ہونے والی اینٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کچھ مزدور بہت محنت سے اینٹیں بنانے کا آمیزہ تیار کر رہے تھے اور کچھ مزدور تیار شدہ آمیزے کو اینٹوں کے سانچوں میں نہایت پھرتی سے بھرتے جارہے تھے جنھیں دوسرے مزدور اٹھا اٹھا کر بھٹے میں پکانے کے لیے لے جارہے تھے۔ بعض مزدوروں کے گھر والے یعنی ان کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ مزدوری کر رہے تھے۔

اگلے روز حامد کے ابو اسے اپنی گاڑی میں اسکول چھوڑنے آئے تو اس کا ساتھی آصف بھی اسکول کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بابا ہمیشہ انتہائی سادہ اور معمولی سے لباس میں ہوتے تھے، وہ اسے کبھی پیدل اور کبھی سائیکل پر اسکول چھوڑنے آتے تھے۔

حامد کو آصف پہلے دن سے ہی بہت اچھا لگا تھا۔ وہ کم عمر ہونے کے باوجود بہت سنجیدہ، ذہین، باادب اور صاف ستھرا لڑکا تھا۔ حامد نے اس کے ساتھ رہ کر یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پاس محض ایک یونیفارم ہے مگر نہایت صاف ستھرا اور اس پر ہمیشہ استری بھی ہوتی تھی۔ اس کے جوتے بھی ہمیشہ گرد و غبار سے پاک ہوتے۔ حامد اپنے دوست آصف کی اچھی عادتوں اور ذہانت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے کئی بار آصف کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی مگر آصف نہ جانے کیوں ٹال مٹول کر جاتا اور کبھی اس کے گھر نہ آیا۔

اتفاق سے چھٹی کے روز حامد کی بازار میں آصف سے ملاقات ہوگئی۔ اس وقت آصف نے حامد سے کہا: ''آج تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تمھیں اپنے امی ابو سے ملوانا چاہتا ہوں۔ بہت ذکر کرتا ہوں میں تمھارا اپنے والدین سے! وہ بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

حامد خوشی خوشی آصف کے گھر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ دونوں پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ آصف کا گھر اگرچہ بہت زیادہ دور نہیں تھا مگر حامد کو پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی، اس لیے وہ آصف سے بار بار پوچھتا تھا: ''بھئی اور کتنی دور چلنا ہے؟ کہاں ہے تمھارا گھر؟''

آصف مسکرا کر جواب دیتا: ''بس تھوڑا سا دور، کچھ ہی دیر میں میرا گھر آنے والا ہے۔''

آخر دونوں چلتے چلتے بڑے بڑے شان دار گھروں کی کالونی کے پیچھے آباد کچی بستی میں داخل ہوگئے۔ ان تنگ گلیوں میں لوگ پیدل ہی چل سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ سائیکل سوار وہاں سے گزر سکتے تھے، وہ بھی بڑی مشکل سے۔

آخر آصف لال اینٹوں سے بنے ہوئے پلستر سے محروم ایک چھوٹے سے گھر کے باہر رک گیا جس کے دروازے پر ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ حامد کی حیرت اور دل چسپی بڑھتی جارہی تھی۔ دروازہ کھٹ کھٹا کر دونوں گھر کے اندر داخل ہوگئے۔ گھر کے صاف ستھرے اور کچے آنگن میں آصف کی امی مٹی کے چولہے پر دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ آصف نے ان سے حامد کا تعارف کرایا تو اس کی امی نے نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لیے چائے تیار کرنے لگیں۔ اس کے بعد آصف حامد کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں لگی ہوئی کھونٹی پر آصف کا دھلا ہوا اور استری شدہ یونیفارم لٹکا ہوا تھا اور نزدیک ہی اس کی کتابیں بھی ترتیب اور سلیقے سے رکھی تھیں۔

آصف نے چائے کی پیالی حامد کی طرف بڑھائی اور کہا: ''حامد! تم ایک امیر گھرانے کے بیٹے جہاں نعمتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن میں مزدور اور محنت کش والدین کا بیٹا ہوں۔ میرے والد بھٹے پر اینٹیں بناتے ہیں اور امی فارغ وقت میں کڑھائی سلائی کا کام کرتی ہیں۔ میں اور میری چھوٹی بہن دونوں اسکول میں پڑھتے ہیں۔ میں بھٹے پر ابو کی مدد کرتا ہوں اور میری چھوٹی بہن سلائی کڑھائی میں امی کی مدد کرتی ہے۔ دراصل میں نے محسوس کیا ہے کہ جیسے ہی کسی بچے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے بابا مزدور ہیں تو وہ مجھ سے دوستی ختم یا کم کر لیتے ہیں مگر میں کسی سے اپنی حقیقت نہیں چھپاتا۔ مجھے اپنے والدین کے مزدور ہونے پر شرم نہیں بلکہ فخر ہے۔ وہ ہماری ضروریات اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ یہی حقیقت تمھیں دکھانے کے لیے میں تمھیں اپنے گھر لایا ہوں۔ اب اگر تم چاہو تو مجھ سے دوستی رکھو اور چاہو تو ختم کر دو۔ یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔''

آصف کی یہ سن کر حامد دوستانہ انداز میں مسکرایا اور بولا: ''میں تمھارے بارے میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے تمھیں تمھارے بابا کے ساتھ بھٹے پر کام کرتے دیکھا تھا اور میں نے خود تم سے دوستی کی، کیوں کہ میرے بابا جان کہتے ہیں کہ ہر سچا اور محنتی انسان عزت کے قابل ہوتا ہے۔ انسان قیمتی لباس سے نہیں، بلکہ اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ میں تم جیسے اچھے اور سچے دوست کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

یہ کہہ کر حامد نے آصف کو گلے لگا لیا۔ n

بے پروائی

وقار عثمان۔ راول پنڈی

ہم دونوں بھائی گاؤں کی جانب جا رہے تھے۔ میں موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور بڑے بھائی ابو بکر پیچھے بیٹھے تھے۔ سفر ذرا لمبا تھا، اس لیے ہم باتیں بھی کر رہے تھے۔ ویسے تو راستہ پکا تھا، مگر کہیں کہیں کچی سڑک آجاتی تو جھٹکے لگتے۔ راستے میں سڑک کے درمیان ایک بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا:

"سڑک کی مرمت کا کام جاری ہے، تکلیف کے لیے معذرت!"

میں نے موٹر سائیکل دائیں طرف موڑلی جہاں سے ایک راستہ گاؤں کی گلیوں سے گزرتا تھا، میں نے بہت احتیاط سے یہ راستہ عبور کیا، کیوں کہ جگہ جگہ روڑے بکھرے ہوئے تھے۔ آگے جا کر پکی سڑک آگئی جس پر آتے ہی میں نے پھر رفتار بڑھادی اور باتیں بھی کرنے لگے۔ آدھا سفر خیریت سے طے ہوا، لیکن جوں ہی ذرا آگے بڑھے تو بھائی ابو بکر نے کہا: "یہاں سے مڑنا ہے۔"

میں نے فوراً بائیک موڑدی اور یہ بھول گیا کہ آگے کھائی جیسا گہرا گڑھا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس کی سزا ہمیں بھگتنی تھی۔ ہماری موٹر سائیکل کنارے سے اتری اور گڑھے میں جاگری۔ میں نے بریک لگانے کی کوشش کی، لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ہم دونوں موٹر سائیکل سمیت گرے تھے۔ اسی دوران ایک شخص ہماری جانب لپکا۔ اسی وقت دو تین لڑکے بھی آگئے جو موٹر سائیکل پر سوار تھے، ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے۔ ہم دونوں کے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ ان لوگوں نے ہم دونوں بھائیوں کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ بٹھایا اور چل دیے، مگر اب ہمارا سفر گاؤں کے بجائے کلینک کی جانب تھا۔ پندرہ منٹ بعد کلینک پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے انجکشن لگائے اور مرہم پٹی کی

۔

پھر بولے: "یہاں ایکسرے کی سہولت نہیں۔ آپ شہر جا کر ایکسرے کروائیں، تاکہ ہڈی میں اگر فریکچر ہو تو پتا چل سکے۔"

غرض وہاں سے روانہ ہوئے اور پھر شہر کی ایک لیبارٹری تک پہنچے جہاں ہم نے ایکسرے بھی کرالیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے آج بھی اپنی بے پروائی کا یہ واقعہ یاد ہے اور اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میں شرمندہ بھی ہوتا ہوں۔ n

بھیڑ اور بھیڑیا

زینب واحد ..... اٹک

جنگل میں ایک بھیڑیا [illegible] پانی
پینے کے لئے ندی کے کنارے پہنچا
اور پانی پینے لگا۔ جس طرف پانی بہہ رہا تھا، اسی طرف نیچے بھیڑیے کی نگاہ ایک بھیڑ کے بچے پر پڑی جو پانی پی رہا تھا۔

بھیڑیے نے سوچا کہ شکار خوب ہاتھ آیا، اسے چیر پھاڑ کر کھانا چاہیے۔ وہ بھیڑیے کے بچے کے نزدیک گیا اور بڑے رعب سے کہا کہ تو نے پانی کیوں گندہ کیا ہے۔ تو نہیں دیکھتا میں پانی پی رہا تھا۔

بھیڑ کا بچہ سہم گیا اور عرض کیا "جناب پانی تو آپ کی طرف سے آ رہا ہے۔ میں تو نیچے کھڑا ہوں، میں آپ [illegible]

یہ سن کر بھیڑیا اور غضب ناک ہو کر بولا "کیا وجہ تھی کہ پچھلے سال تم نے مجھے گالیاں دی تھیں۔"

بھیڑ کے بچے نے عاجزانہ طور پر التجا کی۔ "میری عمر صرف چھ ماہ ہے، میں تو پچھلے سال پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

بھیڑیے نے کہا "پھر تیرا بھائی ہوگا، بھائی نہ ہوگا تو تیرا باپ ضرور ہوگا۔ ان کی غلطی کی پاداش میں تجھے ضرور سزا ملنی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ بھیڑ کے معصوم سے بچے پر جھپٹ پڑا اور اسے کھا گیا۔ اس پر تو یہی کہنا چاہیے۔ برائی کیلئے بہانے بے شمار۔

بگڑا شہزادہ

حمزہ خلیل۔ لیہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہر میں ایک لڑکا اسد رہتا تھا۔ وہ بہت ہی اچھا اور نیک تھا۔ اس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور جماعت میں اوّل آتا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے امی ابو کی ہر بات مانتا تھا۔ اس کی کلاس میں کچھ بچے ایسے بھی تھے۔ جو پڑھائی میں بالکل دل نہ لگاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسد بھی ان کے ساتھ مل کر ان جیسا بن جائے۔ لیکن اسد ان سے دور رہتا۔ لیکن آخر کب تک؟ رفتہ رفتہ وہ بھی ان بچوں کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا شروع ہو گیا، کلاس میں پڑھائی کے بجائے شور شرابہ مچاتا، ہر وقت گراؤنڈ میں کھیلتا، ٹھیلے پر بکنے والی چیزیں خرید کر کھاتا، گھر آ کر یونیفارم تبدیل کرنے کے بجائے، بیگ گلی میں رکھ کر کھیلنے چلا جاتا اور پھر دیر سے گھر آتا، پڑھنے لکھنے سے اس کی دلچسپی جیسے ختم ہو چکی تھی۔ اسد کی امی اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔ انہوں نے اسد کے ابو کو سب کچھ بتایا۔ ابو کے سمجھانے کے باوجود وہ باز نہ آیا۔ آئے دن اسکول سے اسد کی شکایتیں آنے لگیں۔ اسد کے ابو نے ڈانٹ اور مار سے بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

ایک دفعہ اسد گھر آ کر اپنی امی کے پاس گیا۔ سلام کیا، نہایا اور کھانا کھا کر پڑھنے لگا۔ اس کی امی یہ تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ اب بہت خوش تھیں۔ ایک شام کو تقریباً آٹھ بجے اسد نے امی کو کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہے۔ جب ماں نے اجازت دینے سے انکار کیا اور کہا "بیٹا آج موسم ٹھیک نہیں، رات دیر تک باہر رہنا ٹھیک نہیں۔" تو اسد غصے میں آ گیا اور ماں کی بات نظر انداز کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر بڑے منع کریں تو ان کی بات سن لینی چاہیے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی وہ شہر کے دوسرے کنارے پر موجود سینما ہال پہنچا اور اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ آدھی رات کو واپسی کا فیصلہ ہوا مگر جس موٹر بائیک پر وہ اپنے دوست کے ساتھ محو سفر تھا، وہ خراب ہو گئی، اب ایک طرف ان کی بائیک خراب کھڑی تھی تو دوسری طرف موسم بھی بگڑنے لگا اور اچانک بارش شروع ہو گئی۔ چاروناچار اسد اور اس کا دوست پیدل ہی چل پڑے اور 4 گھنٹے تک بارش میں بھیگتے ہوئے گھر پہنچے۔ رات کے 12 بجے جب اسد گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی امی اور ابو دونوں بے چینی سے اس کے منتظر ہیں۔ امی اسے بارش میں شرابور دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی جلدی تولیہ سے اس کا سر پونچھنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ابو اس کے لئے گرم دودھ اور ابلے ہوئے انڈے لے آئے مگر بارش اپنا کام دکھا چکی تھی۔



دوپہر تک اسد بخار میں جل رہا تھا، اس دوران اس کی امی ابو نے اس کا خوب خیال رکھا اور چند دنوں میں جب وہ صحت یاب ہوا تو بے حد شرمندہ تھا۔ اس نے اپنی امی ابو سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی نافرمانی پر بہت شرمندہ ہوں، اگر آپ مجھے ایک موقع دیں تو میں اپنی غلطیوں کو سدھارنا چاہوں گا۔" امی بولیں، "اسد تم ہمارے بیٹے ہو، تمہیں کوئی تکلیف پہنچے گی تو ہمیں بھی تکلیف ہو گی اور ہم کوشش کریں گے کہ ہم اسے کم کر سکیں مگر یہ ہمارا فرض ہے جو ہم نبھاتے رہیں گے، اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم نے غلطی کی ہے اور تم شرمندہ ہو تو پھر کوشش کرو کہ ان عادتوں اور باتوں سے چھٹکارا مل جائے جن کی وجہ سے تمہیں معافی مانگنی پڑی ہے۔" یہ سن کر اسد کا سر جھک گیا اور وہ چند لمحوں بعد سر اٹھا کر بولا۔ "امی ابو میں آپ کو ایک اچھا بیٹا بن کر دکھاؤں گا تاکہ آپ فخر سے کہہ سکیں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں، اور اپنی ان تمام بری عادتوں سے چھٹکارا پا لوں گا جن کی وجہ سے آج آپ شرمندہ ہیں۔" امی ابو اسد کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب ان کا بگڑا شہزادہ، سیدھی راہ پر چل پڑا ہے۔

بلی چوہے کی دشمنی

سمیعہ پرویز۔ اوکاڑہ

کیا آپ کو پتا ہے کہ بلی اور چوہے کی دشمنی کیسے شروع ہوئی؟ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک جنگل میں چوہا اور بلی رہتے تھے۔ دونوں گہرے دوست تھے۔ جس جنگل میں یہ دونوں رہتے تھے، اس کا بادشاہ شیر بھی بہت اچھا اور نیک دل جانور تھا۔ جنگل میں سبھی جانور مل جل کر امن وامان کے ساتھ رہتے تھے۔ شیر بادشاہ ہر سال جنگل میں جانوروں کے درمیان ریس کا مقابلہ کراتا تھا۔ اس میں فرسٹ آنے والے کو بہت سے انعامات ملتے تھے۔ اس سال بھی شیر نے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ جس جگہ سے یہ ریس شروع ہوتی اور جہاں ختم ہوتی تھی، اس پورے راستے کے درمیان ایک خفیہ اور پوشیدہ راستہ بھی تھا جس سے ریس کا راستہ کم ہو جاتا، مگر اس بات کا علم صرف بلی اور چوہے کو تھا۔ اس دفعہ انھوں نے پروگرام بنایا کہ وہ ضرور جیتیں گے۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے وہ دونوں شروع والے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں سے خفیہ راستہ شروع ہوتا تھا اور وہاں سے داخل ہو کر اس جگہ آگئے جہاں دوڑ ختم ہونے والا پوائنٹ تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ چوں کہ وہ دونوں وہاں جلد پہنچ گئے تھے، اس لیے وہ وہاں جا کر اطمینان سے سو گئے۔ بلی تو گہری نیند میں تھی، مگر چوہا تھوڑی دیر بعد شور سن کر اٹھ گیا۔ بلی سوتی رہی۔ چوہے نے دیکھا کہ جانور جیت کے مقام سے تھوڑی دور ہیں تو اس نے دوڑ کر اختتامی پوائنٹ عبور کر لیا اور پہلے انعام کا حق دار قرار پایا۔ جب جنگل کا بادشاہ شیر، جیتنے والے چوہے کو گول میڈل پہنا رہا تھا تو بلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ غصے سے چوہے کو پکڑنے کے لیے دوڑی اور چوہا اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا۔ اس روز سے چوہا کسی اور سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا وہ بلی سے ڈرتا ہے۔ اسی دن سے بلی اور چوہے کی دشمنی شروع ہوئی اور یہ دشمنی ضرب المثل بن گئی۔

n۔

بلی کی دوست

عاصمہ ظفر۔ راولپنڈی

پاکیزہ اور یوسف دونوں بہن بھائی تھے۔ پاکیزہ اپنے ابو کی آنکھ کا تارا تھی تو یوسف امی کے دل کا سکون تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جس میں دو کمرے اور ایک کچن تھا۔ کمروں کے آگے چھوٹا سا صحن تھا جس میں امی نے خوب صورت پھولوں والے پودے لگائے تھے۔ شام کو جب پاکیزہ پودوں کو پانی دیتی تو پھولوں اور مٹی کی خوشبو سارے گھر کو معطر کر دیتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت بہت تیز بارش ہو رہی تھی کہ ایک بلی نہ جانے کہاں سے صحن میں آ گئی۔ وہ بارش میں بھیگ رہی تھی اور اس سے بچنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ پاکیزہ کی امی نے جب یہ دیکھا تو صحن میں پرانی لوہے کی کرسی رکھ دی۔ بلی بارش سے بچ کر اس کرسی کے نیچے آرام سے بیٹھ گئی۔

جب بارش کم ہو گئی تو پاکیزہ کی امی نے تھوڑا سا دودھ ایک پیالی میں ڈال کر بلی کے پاس رکھ دیا۔ پہلے تو بلی ڈرتی رہی، مگر بعد میں دودھ پینے لگی۔ اس کے بعد وہ روز شام کو دیواریں پھلانگ کر آ جاتی اور کبھی وہاں رکھا ہوا دودھ پی لیتی اور کبھی ہڈیاں کھا کر ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی اور صبح تک چلی جاتی تھی۔

یوسف چھوٹا تھا۔ وہ بلی سے خوب کھیلتا۔ بلی کبھی ایک پودے کے پیچھے اور کبھی دوسرے پودے کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھی۔ پاکیزہ بلی سے بہت چڑتی تھی۔ امی ابو کے منع کرنے کے باوجود اکثر بلی کو بھگانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی مارتی تھی۔ اس کی امی اکثر کہتیں: "بیٹا! جانور بھی اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں، ان کو تنگ نہیں کرنا چاہیے ورنہ اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

مگر پاکیزہ امی کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ ایک دن ابو دفتر سے نہیں لوٹے تھے، یوسف امی کے ساتھ پڑوس میں گیا تھا اور پاکیزہ صحن میں بیٹھی پودوں سے کھیل رہی تھی۔ اتنے میں پتا نہیں کہاں سے ایک موٹا سا چوہا پاکیزہ کے پاؤں پر چڑھ گیا۔ پاکیزہ نے بہت زور سے چیخ ماری۔ بلی دیوار پر بیٹھی تھی، چوہے کو دیکھ کر اس نے چھلانگ ماری اور چوہے کو دبوچ لیا۔ چوہا بڑی مشکل سے بلی کے پنجوں سے نکل بھاگا۔ پاکیزہ ابھی تک ڈری ہوئی رو رہی تھی۔ بلی پاکیزہ کے پاس بیٹھ گئی جیسے سمجھا رہی ہو کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں" اس دن کے بعد بلی سے پاکیزہ کی دوستی ہو گئی اور وہ بھی یوسف کی طرح بلی سے کھیلتی ہے۔ امی ابو یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ پاکیزہ اب بلی کو تنگ نہیں کرتی، بلکہ وہ اس کی دوست بن گئی ہے۔ n

چنبیلی کے رنگ

امینہ ریاض۔ گوجرانوالا

اس سمندر میں چنبیلی نامی ایک جل پری رہتی تھی۔ اسے پھولوں سے بہت پیار تھا۔ وہ ایسی جل پری تھی جو جادو بھی جانتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے جادوئی آئینے میں کسی پھول کو مشکل میں دیکھتی تو اس کی مدد کو پہنچ جاتی۔ اس کے پاس بہت سے جادوئی رنگ تھے۔ وہ روزانہ رات کو باغوں میں جاتی اور اگر کسی پھول کا رنگ خراب ہوتا دیکھتی تو اس پر اصل رنگ کر دیتی تھی۔ سمندر میں رہنے والی دوسری جل پریاں جب اس خراب ہونے والے پھول کو نئے رنگ میں دیکھتیں تو خوش ہو جاتیں اور سوچتیں کہ اسے کس نے رنگ کیا ہے۔

چنبیلی پھولوں سے باتیں بھی کرتی تھی۔ اگر کسی پھول کو کوئی تکلیف پہنچاتا تو وہ اسے روک بھی دیتی تھی۔ ایک رات چنبیلی اسی طرح تیرتی ہوئی کسی دوسرے سمندر میں چلی گئی۔ اس نے وہاں ایک باغ دیکھا جو جھاڑیوں میں بری طرح گھرا ہوا تھا اور اس میں لگے ہوئے پھولوں کے پودے بھی جھاڑیوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ وہاں چنبیلی کو ایک ننھی مچھلی ملی جو اس کی دوست بن گئی۔ اس نے چنبیلی کو بتایا: ”یہ باغ ایک چڑیل کا ہے جو پھولوں سے نفرت کرتی ہے اور اپنے باغ میں ایک بھی پھول اگنے نہیں دیتی۔“

چنبیلی ابھی ننھی مچھلی سے باتیں کر رہی تھی کہ اسے اندر سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ اندر جانا ہی چاہتی تھی مگر ننھی مچھلی نے اسے روک دیا اور کہا: ”تم رکو، میں ابھی دیکھ کے آتی ہوں کہ چڑیل سو رہی ہے یا نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو بتایا: ”تم جلدی سے چلی جاؤ، اندر ایک بے رنگ ننھا سا پھول رو رہا ہے۔ چڑیل کے اٹھنے سے پہلے اس پھول کو نیا رنگ کر دو، تاکہ وہ خوش ہو جائے۔“

چنبیلی اندر گئی اور جاتے ہی اس نے پھول پر نیا رنگ کرنا شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑا ہی رنگ ہوا تھا کہ چڑیل چیختی ہوئی وہاں آ گئی اور زور سے بولی: ”میری اجازت کے بغیر تم میرے گھر میں کیسے داخل ہوئیں؟ اور تم اس پھول پر نیا رنگ کر رہی ہو، ابھی تمہیں مزہ چکھاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر چڑیل نے سارے رنگ چھینے اور چنبیلی کے اوپر پھینک دیے۔ ان رنگوں کی چھینٹیں جہاں بھی گئیں، ہر قطرے کی جگہ چنبیلی کا پھول اگ آتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس چڑیل کے گھر میں چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر لگ گیا اور وہ ان پھولوں کو دیکھ کر اندھی ہو گئی۔ اب چنبیلی جہاں بھی جاتی ہے، اس کے اردگرد پھول ہی پھول ہوتے ہیں۔ n

چیونٹیوں کا نظم و ضبط

ثناء ملک ۔ جہلم

آپ لوگوں نے کبھی چیونٹیوں کو غور سے دیکھا ہے؟ چیونٹیوں سے انسان اگر چاہے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے، لیکن پھر بھی ان کیڑے مکوڑوں جیسا نظم و ضبط اس کے اندر نہیں پایا جاتا۔ آپ لوگوں نے زمین پر بہت سے سوراخ دیکھے ہوں گے جہاں سے چیونٹیاں باہر نکلتی اور اندر جاتی ہیں، یہ ان کا گھر ہے ۔ بہت سی چیونٹیاں مل جل کر ایک ساتھ رہتی ہیں جو ان کی کالونی کہلاتی ہے۔ انھوں نے مختلف کام آپس میں بانٹ رکھے ہوتے ہیں۔ کالونی میں سے کچھ چیونٹیاں فوجی چیونٹیاں کہلاتی ہیں۔ یہ اپنے گھر اور اس میں رہنے والوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ ان کیڑے مکوڑوں سے لڑتی ہیں جو ان کے گھر اور اس میں رہنے والوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ انسان آج کا کام کل پر ڈال دیتا ہے، لیکن چیونٹیاں ایسا نہیں کرتیں۔ وہ اپنا ہر کام وقت پر کرتی ہیں۔ شاید وہ انسان سے زیادہ وقت کی پابندی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ کالونی کی کچھ چیونٹیوں کا کام کھانا لانا اور کچھ کا کام ان سے لے کر اس کھانے کو محفوظ کرنا ہے۔ چیونٹیاں سردیوں میں سخت سردی کی وجہ سے باہر نہیں نکلتیں، کیوں ایسا کرنے سے وہ مر سکتی ہیں۔ تمام چیونٹیاں اپنا سارا کھانا گرمیوں کے موسم میں جمع کرتی ہیں اور اس کو سردیوں کے لیے بچا کر رکھتی ہیں۔ ان کی یہ منصوبہ بندی ان کو موسم کے اتار چڑھاؤ سے بچاتی ہے۔ چیونٹیاں ہمیشہ قطار میں چلتی ہیں۔ مجال ہے کوئی بھی چیونٹی قطار سے اِدھر اُدھر ہو۔ چیونٹیوں کو قطار میں چلتے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی محاذ پر جنگ لڑنے جا رہی ہیں۔ انسان کو چیونٹیوں سے بہت سے اصول سیکھنے چاہئیں، تا کہ وہ زندگی میں آگے بڑھ سکے اور تکلیفوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکے۔ بس اسٹاپ ہو یا ریلوے اسٹیشن یا کوئی بھی دوسری جگہ، کیا آپ کو کوئی شخص قطار میں دکھائی دے گا؟ یقیناً نہیں، بلکہ ہر انسان ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کر کے پہلے سوار ہونے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اشرف المخلوقات کے درجے پر پورا اترے۔ اس کے لیے اس کو نظم و ضبط کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ آج کے انسان کے لیے نظم و ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ■

سوئٹزر لینڈ کی لوک کہانی

ڈاکوؤں کے گھر پر جانوروں کا قبضہ

عنبر بیگم۔ کراچی

بہت پرانی کہانی ہے۔ جان نامی ایک شخص کسی چکی پر کام کرتا تھا۔ وہ اپنے مالک کا وفادار تھا اور برسوں سے ایمان داری سے کام کر رہا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو ایک روز اس نے اپنے مالک سے کہا: ''اب میں بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں، آپ کی مزید خدمت نہیں کر سکتا۔ میرا حساب کر دیں، تاکہ میں چلا جاؤں۔''

چکی کے مالک نے کہا: ''تم جا ہو تو جا سکتے ہو، مگر حساب کتاب کیسا، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا۔ میں تمہیں آزاد کر رہا ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

بے چارہ جان خاموش ہو گیا، مگر جانے سے پہلے وہ ان جانوروں کے پاس گیا جن کی وہ طویل عرصے سے دیکھ بھال کر رہا تھا، انہیں کھلاتا پلاتا تھا، ان کی مالش کرتا تھا۔ پہلے وہ گھوڑے سے ملنے گیا تو گھوڑے نے کہا: ''اب تم کہاں جاؤ گے؟''

''پتا نہیں۔'' یہ کہہ کر جان آگے بڑھا تو گھوڑا بھی اس کے پیچھے آ گیا۔ پھر جان بیل کے پاس گیا اور اسے خدا حافظ کہا تو بیل بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ پھر وہ ایک ایک کر کے کتے، بلی اور بطخ کے پاس گیا اور انہیں الوداع کہا تو وہ سب بھی اس کے ساتھ چل پڑے۔

جان اس گاؤں میں آگے بڑھتا گیا، مگر کسی بھی جانور نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ سب اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک جگہ جان نے جانوروں سے کہا: ''میرے دوستو! تم سب واپس جاؤ۔ میرا اپنا کوئی بھروسا نہیں ہے، تمہاری دیکھ بھال کیسے کروں گا؟''

''ہم تم پر بوجھ نہیں بنیں گے۔'' جانوروں نے کہا اور وہ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ کئی روز بعد وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچے جہاں بہت زیادہ گھاس تھی۔ یہ دیکھ کر گھوڑا، بیل، بطخ اور مرغ تو خوش ہو گئے، مگر کتے، بلی وغیرہ خوش نہیں ہوئے، کیوں کہ وہ گھاس نہیں کھاتے تھے۔ وہ اور جان پہلے ہی بھوکے تھے، مگر کسی بھی جانور نے کوئی شکایت نہیں کی۔

جان اور اس کے دوست جانور گھنے جنگل کے اندر پہنچے تو انہیں ایک بہت بڑا اور خوب صورت گھر دکھائی دیا جو بند تھا۔ اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، صرف ایک تھان ہی کھلا تھا جہاں سے وہ سب کھلیان سے گزر کر گھر کے اندر جا سکتے تھے۔ چوں کہ گھر میں کوئی نہیں تھا، اس لیے جان نے اپنے جانوروں کے ساتھ وہیں رہنے کا فیصلہ کیا اور ہر جانور کو الگ جگہ دی۔ اس نے گھوڑے کو تھان میں رکھا، بیل کو اس کے پیچھے بھیج دیا، مرغ کو چھت پر بھیجا، کتے کو کھاد کے ڈھیر کے پاس رکھا، بلی کو آتش دان کے پاس جگہ دی اور بطخ کی ڈیوٹی چولہے کے پیچھے لگائی گئی۔ اس گھر میں خوراک کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، اس لیے جان نے ہر ایک کو اس کی خوراک بھی دی۔ پھر اس نے خود بھی ڈٹ کر کھایا پیا اور ایک بستر پر آرام سے سو گیا۔

رات کو جب وہ گہری نیند میں تھا تو اس گھر کا مالک ڈاکو آ گیا۔ جیسے ہی وہ احاطے میں داخل ہوا تو کتا بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی مرغ نے بھی چھت سے بانگ دینی شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر ڈاکو خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے جانوروں کو پہلے کبھی اس طرح رہتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو صرف جنگلی جانوروں سے واقف تھا۔ ڈاکو گھبرا کر تھان کی طرف بھاگا تو وہاں موجود گھوڑے نے اسے لات مار کر گرا دیا۔ وہ پیچھے کی طرف بھاگا تو وہاں بیل نے اسے سینگوں پر اچھال دیا۔ ڈاکو بھاگتا ہوا کھلیان کے اندر کچن میں پہنچا اور آتش دان جلانا چاہا تو وہ پہلے سے روشن تھا۔ اسے دیکھتے ہی بلی اس پر جھپٹی، پھر بطخ نے بھی اپنے پروں کو زور زور سے پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔ خوف زدہ ڈاکو اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک انسان کو سکون سے سوتے دیکھ کر حیران رہ گیا جو زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ اتنا پریشان ہوا کہ گھر سے نکل بھاگا اور جنگل میں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ جب اس نے انہیں بتایا کہ ان کے گھر پر جانوروں کا قبضہ ہو گیا تو وہ سب اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ان کے کمرے کے بستر پر کوئی انسان گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ ساری کہانی سن کر ڈاکو اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے گھر پر بدروحوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ کسی دوسرے جنگل میں جا کر رہیں گے۔ اس کے بعد وہ سب اس جنگل سے چلے گئے۔ ڈاکوؤں کے اس گھر میں جان اپنے دوست جانوروں کے ساتھ امن اور سکون سے رہتا رہا۔ اب نہ اسے اپنے بڑھاپے کی فکر تھی اور نہ کھانے پینے کی، اس کے گھر کے سامنے پھل دار درخت بھی تھے اور سبزیاں بھی۔ وہ سب جانور اپنی اپنی پسند کی خوراک کھاتے تھے اور جان کے ساتھ خوش رہتے تھے۔n

دل کی دنیا بدل گئی

محمد علیم نظامی۔ لاہور

کسی زمانے میں شہر بغداد میں دو چور رہتے تھے۔ وہ دن بھر آرام کرتے اور جیسے ہی تاریکی بغداد شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تو دونوں اپنا سامان اٹھا کر چوری کرنے کے لیے نکل جاتے۔ جس گلی میں ان چوروں کا گھر تھا، اس گلی میں ایک اللہ والے بزرگ بھی رہتے تھے۔ وہ ان چوروں کو اکثر نصیحت کرتے تھے کہ بیٹا! چوری چکاری کے ان کاموں سے باز آجاؤ۔ چوری کرنا بہت گناہ کا کام ہے، مگر ان دونوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ بزرگ کی بات ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔

ان چوروں نے بغداد شہر کے باہر ایک جنگل میں ایک خفیہ ٹھکانا بنایا ہوا تھا جو ایک چھوٹے سے غار کی شکل میں تھا۔ دونوں چور چوری کیا ہوا سارا مال اس جگہ جمع کرتے تھے۔ رات کو چوری کرتے اور چوری شدہ مال راتوں رات اس غار میں چھپا کر اپنے گھر واپس لوٹ آتے۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ ان دونوں نے قاضی شہر کے گھر چوری کرنے کا پروگرام بنایا۔ چناں چہ رات کے پچھلے پہر وہ دونوں اپنے گھر سے روانہ ہوئے اور قاضی کے گھر پہنچے جہاں انہوں نے گھر کے پچھلے حصے میں کھڑے ہو کر رسی کی کمند بنا کر دیوار کے اوپر پھینکی۔ دیوار ذرا اونچی تھی۔ دو تین بار کوشش کرنے کے بعد اوپر جا کر منڈیر میں اٹک گئی۔ دونوں چور اس کی مدد سے اوپر چڑھ گئے اور پھر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ قاضی کا ایک ہی دربان تھا جو گھر کے بڑے دروازے پر مامور تھا۔ اندر کی اس کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ قاضی کی ایک ہی بیٹی تھی جو بڑی نیک اور پارسا تھی۔ لڑکی کے کمرے سے تک چراغ کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر باہر آرہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ انھوں نے دروازے کی جھری سے اندر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کمرے کے اندر قاضی کی بیٹی نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس نے نماز پڑھنے کے بعد رو رو کر اللہ کے حضور یہ دعا مانگی: ”اے اللہ! اس کائنات کے مالک و رازق! ہمیں رزق حلال عطا فرما اور اپنے ہاتھ سے کی گئی محنت مزدوری سے حاصل ہونے والی آمدنی سے گزر اوقات کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ پاک! ہمیں ہمت عطا فرما کہ میں اور میرے والد کسی کا حق نہ ماریں۔ میرے والد قاضی شہر کے فرائض نیک نیتی سے ادا کریں اور لوگوں کے حقوق ادا کریں۔“

دعا مانگنے کے بعد لڑکی نے اپنے کمرے کی تجوری میں سے دینار نکالے اور ان کو الگ الگ پوٹلیوں میں رکھ کر ان پر نام لکھنے شروع کر دیے۔ یہ منظر دیکھ کر دونوں چوروں کے دل ایک دم بدل گئے اور وہ سوچنے لگے کہ ہم رات کی تاریکی میں چوریاں کرتے ہیں اور یہ نیک لڑکی امیر ہونے کے باوجود اتنی غریب پرور ہے کہ اسے رات میں بھی سکون نہیں ہے۔ انہوں نے اسی وقت چوری سے توبہ کر لی اور قاضی کے سامنے پیش ہو کر کہا: ”ہم چوریاں کرتے رہے ہیں، ہمیں سزا دی جائے۔“

قاضی نے ان کی کہانی سننے کے بعد ان دونوں کو معاف کر دیا اور وہ دونوں اپنے دور کے بڑے بزرگ ثابت ہوئے۔

n

دودھ کا گلاس

ترجمہ: افشاں بیگم

ایک روز ہاورڈ کیلی نام کا ایک غریب بچہ گھر گھر جا کر مختلف چیزیں بیچ رہا تھا، تاکہ اپنے اسکول کی فیس ادا کر سکے۔ وہ بھوکا بھی تھا، مگر اس کے پاس اپنے استعمال کے لیے صرف ایک سکہ ہی باقی بچا تھا، باقی رقم اس نے اسکول کی فیس جمع کرنے کے لیے رکھ لی تھی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ کسی گھر کا دروازہ کھٹ کھٹا کر وہاں سے کچھ کھانے کو مانگ لے۔ وہ تھوڑا سا ہچکچاتا ہوا ایک گھر کے دروازے پر پہنچا اور وہاں دستک دی۔ ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا تو ہاورڈ کیلی گھبرا گیا، وہ اس عورت سے کھانا مانگنے کی ہمت نہ کر سکا اور صرف ایک گلاس پانی ہی مانگا۔ نوجوان عورت نے اسے غور سے دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ یہ بھوکا ہے۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور دودھ کا ایک بڑا گلاس لے کر باہر آئی۔ ہاورڈ کیلی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے وہ گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دودھ پینے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے نوجوان عورت سے پوچھا: ''اس کے کتنے پیسے دینے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' نوجوان عورت نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا: ''میری ماں مجھ سے کہتی تھیں کہ نیکی کے کام کا معاوضہ کبھی نہیں لینا۔''

''تو پھر میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' ہاورڈ کیلی نے خلوص سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ مگر اب وہ خود کو جسمانی اور روحانی طور پر زیادہ توانا محسوس کر رہا تھا۔ خدا پر اس کا ایمان اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ وہ عورت بوڑھی بھی ہو گئی اور بیمار بھی۔ مقامی ڈاکٹروں سے جب اس کا علاج نہ ہو سکا تو انہوں نے اسے بڑے شہر کے ایک بڑے اسپتال بھجوا دیا۔ بڑے اسپتال والوں نے بوڑھی عورت کی بیماری کے بارے میں مشورے کے لیے ڈاکٹر ہاورڈ کیلی سے رابطہ کیا۔ جیسے ہی اس نے اس قصبے کا نام سنا جہاں سے کوئی مریضہ لائی گئی تھی تو وہ چونک گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ وہ فوری طور پر اسپتال پہنچا اور مریضہ کے پاس گیا۔ اس وقت وہ ڈاکٹر کا مخصوص گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اپنی مریضہ کو دیکھتے ہی ڈاکٹر ہاورڈ کیلی اسے پہچان گیا۔ وہ اس کی وہی محسنہ تھی جس نے برسوں پہلے اسے دودھ کے گلاس کا تحفہ دے کر اس کی بھوک مٹائی تھی۔

ڈاکٹر ہاورڈ کیلی نے فوری طور پر دوسرے کمرے میں جا کر تمام ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ میں اس عورت کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ چناں چہ وہ پوری توجہ اور لگن سے اپنی محسنہ کا علاج کرنے لگا۔ آخر اس کی محنت رنگ لائی اور وہ عورت صحت یاب ہو گئی۔

اب ڈاکٹر ہاورڈ کیلی نے اسپتال کے شعبۂ حسابات کو ہدایت کی کہ مریضہ کا بل مجھے بھیج دو۔ جب بل اس کے سامنے آیا تو اس نے بل کے کونے پر کچھ لکھا اور وہ بل بوڑھی عورت کو بھجوا دیا گیا۔

بوڑھی عورت کافی دیر تک خوف زدہ نظروں سے اس لفافے کو دیکھتی رہی جس میں اسپتال کا بل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر وہ ساری زندگی بھی دن رات کام کرتی تب بھی اس بل کی ادائیگی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کچھ ہمت کر کے اس نے بل نکالا تو اس کے کونے پر یہ لکھا نظر آیا:

''ایک گلاس دودھ کے عوض پورا بل ادا ہو گیا'' اس کے نیچے ڈاکٹر ہاورڈ کیلی کا نام بھی لکھا تھا۔ بوڑھی عورت کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: ''میرے خدا، تیرا شکر ہے کہ تیری محبت آج بھی انسانوں کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔'' n

دھوپ چھوڑ دو

محمد عماد بیگ۔ کراچی

ایک بار سکندر اعظم اپنی فوجی مہم سے واپس آیا تو اس نے کورنتھ میں بڑے بڑے یونانی راہ نماؤں سے ملاقات کی۔ ان سبھی نے سکندر کی شان میں بڑے قصیدے پڑھے اور اس کی دل و جان سے تعریف کی۔ وہاں دیو جانس کلبی بھی موجود تھا جو اپنے آپ میں مست رہنے والا فلسفی تھا۔ وہ یونانی فلسفی سینوپ میں پیدا ہوا، ایتھنز میں رہتا تھا اور اکثر ماتا دیوی کے مندر میں ایک ٹب میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار بحری قزاقوں کے قبضے میں آگیا جنھوں نے اسے کورنتھ کے ایک دولت مند کے ہاتھوں بیچ دیا۔ اس نے اپنے مالک کے بچوں کو تعلیم دی جس کے بدلے میں اسے رہائی ملی۔ دیو جانس کلبی کسی دیانت دار آدمی کی تلاش میں شہر میں روشن چراغ لیے پھرتا تھا۔ اسے بادشاہ اچھے نہیں لگتے تھے، اس لیے وہ ان کی تعریف بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دولت اور حکومت انسان کو سچائی اور بھلائی کے راستے سے ہٹا دیتی ہے جس سے ہم سادہ اور مزے دار زندگی کے ذائقے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس نے دنیا کے عیش و آرام کو نظر انداز کر دیا تھا اور کورنتھ شہر میں ایک نالے کے کنارے پڑا رہتا تھا۔ سکندر اعظم کو جب دیو جانس کلبی کے بارے میں پتا چلا تو وہ اس سے ملنے گیا۔ اس وقت دیو جانس کلبی آنکھیں بند کیے دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ سکندر زبردست قسم کی چمک دار فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ اس نے دیو جانس کلبی سے کہا: ”آپ مجھ سے کوئی بھی فرمائش کریں، میں پوری کروں گا۔“

”سکندر! دھوپ چھوڑ دو۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، تاکہ میں دھوپ کا مزہ لے سکوں۔“ دیو جانس کلبی نے جواب دیا تو سکندر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”اگر میں سکندر اعظم نہ ہوتا تو دیو جانس کلبی بننا پسند کرتا۔“ n

دوستی کی جیت

سید محسن علی زیدی

"کیا؟ پر کیسے؟" عمران کو حیرت ہوئی۔ "ہاں ہمیں یہ لوگ روز ایک ایک دن کسی جگہ پر کھڑا کر دیتے ہیں اور ہم ایسے لگتے ہیں جیسے ٹیوشن جا رہے ہیں اور ہم کسی بھی گاڑی کو رکوا لیتے ہیں کہ آگے تک چھوڑ دیں، پھر ہم لوگ کسی سنسان والی جگہ پر گاڑی رکوا لیتے ہیں اور اس گروہ کے لوگ پیچھے سے آ کر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔" زمان نے جلدی جلدی تفصیل بتائی۔ "مگر تم لوگ ان کے قبضے میں آئے کیسے؟" "بس کچھ مت پوچھو، ہفتے والے دن ہم اسکول سے گھر واپس جا رہے تھے اور وہی موٹر سائیکل کی بات کر رہے تھے جو بہت خوبصورت تھی پھر ہم اس کے قریب چلے گئے مگر اس وقت اس کے پاس کوئی نہ تھا ہم اسے دیکھ کر باتیں کرنے لگے کہ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا اور پوچھا ہاں بچو! اچھی لگ رہی بائیک؟ ہم نے کہا ہاں بہت زبردست ہے کتنے کی ہے؟ اس نے کہا ارے مفت ملی ہے۔ ہم نے جب یہ سنا تو ہمارے دل میں لالچ آ گیا۔ ہم نے اس اجنبی آدمی سے پوچھا کہ کیا ہمیں یہ بائیک مل سکتی ہے؟ تو اس نے کہا ہاں کیوں نہیں... ہم اس کی باتوں میں آ گئے اور بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلے آئے وہ ہمیں اپنے اڈے پر لے آیا اور ہمیں ایک شخص کے پاس لے گیا جو ان کا سردار تھا اور اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ہم نے کہا یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟ پھر اس نے کہا کیوں بائیک نہیں چاہیے اور ایک زوردار تھپڑ لگایا۔ ہم نے کہا ہمارے والدین پریشان ہوں گے ہمیں جانے دو مگر اس نے کہا اب تم کہیں نہیں جا سکتے۔ جیسا ہم کہتے ہیں ویسا کرو ورنہ تمہارے ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں گے۔ زمان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ عمران نے کہا "یہ تو بہت افسوس کی بات ہے مگر تم فکر نہ کرو میں تمہیں ان کی قید سے ضرور رہائی دلواؤں گا، ابھی تمہارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں اس طرح کاشف کی جان کو خطرہ ہے تم مجھے ان کا پتہ بتاؤ۔" زمان نے پتہ بتایا اور کہا "اب وہ لوگ کسی دوسری جگہ کارروائی کریں گے کیونکہ یہاں کافی دن ہو گئے ہیں ہم نے کل ہی انہیں باتیں کرتے سنا ہے۔" عمران نے ساری تفصیل غور سے سنی۔

زمان نے کہا "دوست تم جلدی کچھ کرو، اب مجھے چلنا چاہیے کہیں انہیں شک نہ ہو جائے۔" پھر عمران نے زمان کو گلے لگایا اور تسلی دی کہ میں ضرور تمہیں آزاد کرا لوں گا۔ عمران سے رخصت ہو کر زمان نے دوڑ لگا دی، اب عمران پھر گھر کی طرف روانہ ہوا، اس نے سب سے پہلے امی ابو کو گزشتہ روز ہونے والے تمام واقعات کی تفصیل بتائی اور وہ تحریر بھی دکھائی جو اسے زمان کی طرف سے ملی تھی۔ ابو نے سب سے پہلے ان تمام واقعات سے زمان اور کاشف کے گھر والوں کو آگاہ کیا جس کے بعد سب بنا تاخیر کے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ پولیس نے ان تمام واقعات کی تفصیل پوچھی اور عمران کی مدد سے وہ تمام ایڈریس لکھے جو عمران کو زمان سے پتہ چلے تھے۔

ان تمام کارروائیوں کے بعد انسپکٹر صاحب نے ایک ٹیم بنائی، پلان کے مطابق ایک پولیس والے کو ایک کار دی گئی جو آفس کے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اسے وہاں موجود زمان کے پاس جانا تھا۔ شام کے وقت کار اس راستے پر چلی، آگے جا کر اسے کسی بچے نے روکا جو زمان ہی تھا۔ کار سے کچھ فاصلے پر موبائلیں اپنی پوزیشن سنبھالے کھڑی تھیں۔ زمان کے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ڈرائیور نے کان میں لگے "ہینڈ سیٹ" سے پیچھے کھڑی موبائلوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ایک مشکوک گاڑی نظر آ رہی ہے۔ اس نے ہوشیاری سے زمان کو گاڑی میں بٹھا لیا اور وہاں سے چل دیا۔ تھوڑی آگے جا کر سنسان میں زمان نے گاڑی رکوائی جیسے ہی زمان اترنے لگا پیچھے سے آنے والی گاڑی رکی اور اس میں سے ایک آدمی اتر کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک دروازے پر کھڑا ہو گیا اور کہا "جو کچھ ہے نکال دو ورنہ"۔ ڈرائیور نے جیب کی طرف ہاتھ کیا اور اپنا ریوالور نکالتے ہی برابر بیٹھے ہوئے شخص پر فائر کیا، اتنی دیر میں ایک اور فائر ہوا اور دروازے پر کھڑے شخص کے ہاتھ سے بھی پستول گر گئی اور وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر چلانے لگا۔ پولیس نے گاڑی میں بیٹھے شخص کو بھی اپنی حراست میں لے لیا۔ انسپکٹر صاحب نے فوراً ایمبولینس کو فون کیا اور ان دونوں زخمیوں کو اسپتال روانہ کیا اور ڈرائیور کو ساتھ لیے ان کے اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ پولیس چوکنا ہو کر اندر داخل ہوئی اور فوراً اس کمرے کی طرف گئی جہاں کاشف موجود تھا۔ جیسے ہی پولیس نے دروازہ کھولا تو پولیس کو دیکھ کر کاشف ڈر گیا۔ انکل میں نے کچھ نہیں کیا پلیز مجھے اپنے ساتھ مت لے کر جائیے گا" مگر جب کاشف کی نظر عمران پر پڑی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "عمران...... تم یہاں......؟" عمران نے اسے گلے لگا کر کہا "ہاں میرے دوست...... لڑائی اپنی جگہ اور دوستی اپنی جگہ۔" یہ سن کر کاشف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں انسپکٹر صاحب نے کہا "چلو بیٹا اب ہمیں جلدی سے اسپتال پہنچنا ہے۔ راستے میں انسپکٹر صاحب نے سب کے والدین کو اسپتال بلوا لیا۔ جیسے ہی کاشف اور زمان پر ان کے والدین کی نظر پڑی تو خدا کا شکر ادا کیا اور انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور رونے لگے۔ اتنے میں انسپکٹر صاحب نے کہا "آپ کے بچوں کو آپ سے ملوانے کا کریڈٹ عمران کو جاتا ہے جس کی عقلمندی اور سچی دوستی نے ہمیں کامیابی دلائی اور ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ہماری ہر ممکن مدد کی۔ عمران نے سب سے داد سمیٹی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ تینوں دوست آپس میں گلے ملے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ ایک زوردار نعرہ بلند کیا...... "یہ سچی دوستی کی جیت ہے۔"

فاختہ نے لکڑہارے کو معاف کر دیا

اقراء نذیر۔ پیر عادل

کسی جنگل میں ایک رحم دل ہاتھی رہتا تھا۔وہ جنگل کے سبھی جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا اور ہمیشہ ان کی مدد کرتا تھا۔ایک مرتبہ جنگل میں ایک لکڑہارا لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔قریبی درخت کی شاخ پر ایک فاختہ بیٹھی تھی۔ لکڑہارے نے اسے نہیں دیکھا اور اس شاخ کو بھی کاٹ دیا جس پر فاختہ بیٹھی تھی۔فاختہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔دور سے ہاتھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔وہ جلدی سے فاختہ کے پاس آیا اور اس کو اپنی سونڈ میں اٹھا کر درخت کے سائے میں لٹایا اور پانی ڈھونڈنے لگا۔اسی وقت اسے ایک لومڑی مل گئی۔ہاتھی نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو لومڑی نے کہا کہ اس علاقے میں ایک بوڑھی شیرنی رہتی ہے۔وہ کہیں دور سے پانی لاتی ہے، مگر کسی کو نہیں دیتی، ہم اس سے کہہ کر دیکھتے ہیں۔

چناں چہ وہ دونوں شیرنی کے پاس گئے اور لومڑی نے شیرنی سے کہا: ”ہمیں تھوڑا سا پانی چاہیے۔ ہماری ایک دوست فاختہ کی حالت خراب ہے۔“

شیرنی نے کہا: ”ویسے میں کسی کو پانی نہیں دیتی، مگر تمھیں تھوڑا سا دے رہی ہوں۔“

انہوں نے شیرنی سے پانی لیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔فاختہ کو پانی پلایا گیا تو اسے ہوش آ گیا۔اب سب مل کر لکڑہارے کے پاس گئے اور اس سے کہا: ”اگر تم اسی طرح بغیر دیکھے درخت کاٹو گے تو کئی جانوروں کو نقصان پہنچے گا۔ صرف سوکھے درخت کاٹا کرو، ہرے بھرے درخت کاٹنے سے گریز کرو۔ ہم جانوروں کا گزارہ درختوں کے پتوں پر ہوتا ہے۔اگر ہمیں یہ خوراک نہ ملی تو ہم زندہ کیسے رہیں گے؟“

لکڑہارے نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بغیر دیکھے درخت نہیں کاٹے گا۔وہ تینوں لکڑہارے کی بات سن کر بہت خوش ہوئے اور فاختہ نے لکڑہارے کو معاف کر دیا۔n

فقیر کی آزمائش

روبینہ ناز۔ کراچی

ایک فقیر کسی محلے میں زور زور سے صدا لگا رہا تھا: ”جیسی کرنی ویسی بھرنی، بھلے کا انجام بھلا، برے کا انجام برا۔“ اس کی یہ آواز ایک عورت نے بھی سنی تو اس نے اپنے دل میں کہا: ”فقیر جھوٹ کہتا ہے۔ میں آج اسے آزماتی ہوں۔“

یہ سوچ کر اس نے دو روٹیاں اس طرح پکائیں کہ ان میں زہر ملا دیا، پھر اس نے دونوں روٹیاں فقیر کو دے دیں۔

فقیر نے عورت سے وہ روٹیاں لے کر اسے دعا دی اور اپنی راہ پر چلا گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد فقیر بستی سے باہر ایک کنویں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے جھولی سے عورت کی دی ہوئی روٹی نکالی اور اسے کھانے والا ہی تھا کہ دو بھوکے پیاسے ادھر آ نکلے۔ انہوں نے فقیر سے کہا: ”بابا! ہم بہت بھوکے ہیں۔ اگر تمہارے پاس کچھ روٹی زیادہ ہو تو ہمیں بھی کھانے کو دے دو۔“

فقیر نے ان کی بات سنی تو اسے ان پر ترس آ گیا اور اس نے وہ دونوں روٹیاں ان کو دے دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کنویں سے تازہ اور ٹھنڈا پانی نکال کر ان دونوں کے آگے رکھ دیا۔ دونوں نے بیٹھ کر وہ روٹیاں کھائیں۔ پھر کنویں کا ٹھنڈا پانی پیا اور فقیر کا شکریہ ادا کر کے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ان پر زہر کا اثر ہونے لگا اور دونوں کی طبیعت بگڑ گئی۔ یہ دیکھ کر فقیر پریشان ہونے لگا، مگر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔ فقیر ان کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا وہ فوراً دوڑ کر اس عورت کے پاس آیا جس نے وہ روٹیاں اسے دی تھیں۔ فقیر نے عورت سے کہا: ”اے عورت تو نے روٹیوں میں کیا ملایا تھا؟“

عورت نے کہا: ”میں نے تو کچھ نہیں ملایا، مگر ہوا کیا؟“

فقیر نے اس پر عورت سے سارا حال کہہ سنایا۔ وہ عورت، فقیر کے ساتھ فوراً جنگل میں پہنچی اور مرنے والوں کی لاشیں دیکھتے ہی زور زور سے رونے پیٹنے لگی۔

فقیر نے پوچھا: ”تجھے کیا ہوا؟ تو روتی کیوں ہے؟“

بدنصیب عورت نے جواب دیا: ”یہ میرے شوہر اور بیٹے کی لاشیں ہیں۔ تم گلی میں کہتے پھرتے تھے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، بھلے کا انجام بھلا، برے کا انجام برا۔ مگر مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آیا تو میں نے روٹیوں میں زہر ملا دیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا، وہ میرے آگے آ گیا۔ میں نے اپنی غلطی سے اپنا گھر تباہ کر لیا۔ میں تو کہیں کی نہ رہی۔“

فقیر نے کہا: ”اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟“

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، بھلے کا انجام بھلا، برے کا انجام برا۔

بے وقوف گدھا

محمد فرحان مغل، ظریف عطا۔ وہوا

کسی قصبے میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ایک رات وہ سو رہا تھا کہ ایک چور اس کے گھر کے پچھواڑے میں آگھسا۔دھوبی کا کتا اور گدھا جو ایک کھونٹے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، چور کو دیکھ کر گدھا، کتے سے بولا: ”کتے بھائی! دیکھو چور گھر میں گھس آیا ہے اور تم بھونک بھی نہیں رہے حالاں کہ یہ تمہارا فرض ہے کہ تم بھونک کر مالک کو جگاؤ۔اگر تم ایسا نہیں کروگے تو چور چوری کر کے رفوچکر ہو جائے گا۔“

کتے نے جواب دیا: ”دیکھو میں دن رات مالک کے گھر کی چوکیداری کرتا ہوں، مگر تم بھی کوئی کم کام نہیں کرتے۔ پھر ہمیں ملتا ہی کیا ہے، پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں ملتا۔“

گدھا بولا: ”میں نے تو سوچ لیا ہے، میں کسی صورت نہیں بھونکوں گا۔جب تک مالک کا نقصان نہیں ہوگا، وہ ہماری دیکھ بھال نہیں کرے گا۔ایسے مالک کا کیا فائدہ جو اپنے کام سے کام رکھے اور ہماری پرواہ نہ کرے۔“

گدھا غصے میں آگیا اور بول اٹھا: ”اے مطلب پرست! تو اپنے فرض میں کوتاہی کر سکتا ہے، مگر میں تیری طرح نہیں ہوں۔ لگتا ہے مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر گدھا زور زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا۔ گدھے کی آواز سے دھوبی کی آنکھ کھل گئی۔اس کو نیند خراب ہونے پر بہت غصہ آیا، چناں چہ اس نے ڈنڈا اٹھایا اور بے چارے گدھے کو مارنے لگا۔ گدھا پٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا: ”واقعی ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے، دوسروں کے کام میں کبھی ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔“ n



قمر ناز دہلوی

بہت پہلے وقتوں کی بات ہے کہ افغانستان کے علاقے طخارستان کے ایک گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک تھا بہت چالاک اس لیے اس کا نام تیز ہوش پڑ گیا۔ دوسرا بے چارہ بہت سادہ آدمی تھا، اسے لوگ خرم دل کہتے تھے۔ ایک دن دونوں سفر پر نکلے، راستے میں انہیں اشرفیوں کی ایک تھیلی مل گئی، دونوں بہت خوش ہوئے۔ خرم دل نے کہا۔ ''آؤ یہ اشرفیاں آدھی آدھی کرلیں، آدھی تمہاری آدھی میری۔''

تیز ہوش نے چالاکی دکھائی، کہا کہ ''عقلمندی اس میں ہے کہ اپنی ضرورت کے لیے چند اشرفیاں نکال لیں، باقی یہاں کسی پیڑ کے نیچے داب دیں، جب واپس آئیں گے تو نکال لیں گے۔ اگر ابھی ساتھ لے کر چلتے ہیں تو چوری چکاری کا ڈر ہے۔''

خرم دل کو یہ مشورہ اچھا لگا، دونوں نے مل کر اشرفیوں کی تھیلی کو ایک پیڑ کے نیچے داب دیا، پھر وہ آگے سفر پر چل پڑے۔ جب رات ہوئی اور خرم دل سو گیا تو تیز ہوش چپکے سے اٹھا، اس پیڑ کے پاس گیا اور اشرفیوں کی تھیلی نکال کر اپنے پاس چھپالی۔

کچھ دنوں بعد جب وہ لوگ سفر سے پلٹے تو مشورہ کر کے کہا آؤ اشرفیوں کی تھیلی نکالتے ہیں اور اس پیڑ کے پاس پہنچ گئے مگر جب زمین کھودی تو تھیلی کو غائب پایا۔ تیز ہوش نے خرم دل سے کہا۔ ''تھیلی تم نے نکال لی ہے۔'' خرم دل نے اپنی بہت صفائی پیش کی مگر تیز ہوش نے ایک نہ مانی، خوب شور مچایا پھر خرم دل کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گیا۔ قاضی نے تیز ہوش سے کہا کہ اپنے ''گواہ لاؤ۔'' تیز ہوش نے کہا۔ ''میرا گواہ درخت ہے، آدمی اس وقت کوئی نہیں تھا۔ درخت سے چل کر آپ پوچھ لیں۔'' قاضی نے یہ تجویز منظور کرلی۔ اب تیز ہوش اپنے باپ کے پاس گیا اور اسے ساری بات بتائی اور کہا کہ ''درخت اندر سے کھوکھلا ہے، آپ رات کو اس کھوکھلے درخت کے اندر جا بیٹھیں، جب صبح کو قاضی آ کر پوچھے تو آپ اندر سے جواب دیں کہ تھیلی خرم دل نے نکالی ہے۔''

باپ نے تیز ہوش کو سمجھایا کہ بیٹے جھوٹ اور فریب سے باز آ، مگر بیٹا کہاں باز آتا تھا۔ باپ نے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر وہی کیا جو بیٹے نے کہا تھا۔ قاضی نے صبح ہی صبح آ کر درخت سے پوچھا کہ ''اے درخت بتا! اشرفیوں کی تھیلی کس نے یہاں سے نکالی ہے؟'' درخت سے آواز آئی۔ ''خرم دل نے۔''

قاضی تھا سیانا آدمی، آخر روز مقدمے سنتا تھا، ایسی باتیں خوب سمجھتا تھا، سو وہ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی چکر ہے۔ درخت خود نہیں بولا ہے، اندر کوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ درخت کے نیچے ایندھن رکھ کر آگ لگادو۔

جب درخت میں آگ لگی تو اندر سے بوڑھا باپ چلایا۔ دہائی دی کہ درخت کے اندر میں ہوں، لوگوں نے آگ بجھائی۔ کھوکھلے درخت سے بوڑھے کو نکالا، وہ بے چارہ بری طرح جھلس گیا۔ اس نے بتایا کہ میں تیز ہوش کا باپ ہوں، پھر تیز ہوش کی چالاکی لوگوں کو بتادی۔ اصلی بات بتا کر وہ بوڑھا دنیا سے سدھارا۔ تیز ہوش رسوا ہوا، خرم دل بری ہوگیا...... یوں تیز ہوش کو اس کی چالاکی کی سزا مل گئی۔

غلطی کا احساس

ابراہیم رضوان۔ کراچی

"سلمان! کہاں ہو تم؟ یہ اتنے ڈھیر برتن کون دھوئے گا؟" یہ علی کی آواز تھی جو سخت لہجے میں سلمان کو باورچی خانے میں بُلا رہا تھا۔

سلمان بارہ سال کا یتیم لڑکا تھا جس کی ماں اس وقت دنیا سے چلی گئی تھی جب وہ سات سال کا تھا۔ پھر اس کے ابو نے دوسری شادی کر لی۔ اس کی سوتیلی ماں کے پہلے سے دو بچے تھے: علی اور نیہا، دونوں ہی سلمان سے چھوٹے تھے۔ جب سلمان دس سال کا ہوا تو اس کے ابو ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے۔ اس وقت سے سلمان اپنی سوتیلی ماں اور بہن بھائی کے ساتھ رہ رہا تھا جنھوں نے اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔

اس وقت بھی علی کی آواز نے سلمان کو ڈرا دیا تھا۔ جب وہ باورچی خانے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے جو علی اور اس کے دوستوں نے لگایا تھا۔

علی اور اس کی بہن نیہا ہر وقت پارٹیوں میں مشغول رہتے تھے، پڑھائی سے ان دونوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن سلمان گھر کے کام کاج کے ساتھ دل لگا کر پڑھتا بھی تھا۔ وہ ایک عام سے اسکول میں پڑھتا تھا، جب کہ اس کے سوتیلے بہن بھائی شہر کے مشہور اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ علی اور نیہا کے پاس ڈھیروں کپڑے بھی تھے، مگر سلمان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے تک نہیں تھے۔

آج علی کی امی اپنی فیملی کو لے کر پکنک پر جا رہی تھیں۔ سب کے چہروں پر خوشی تھی لیکن سلمان کے لیے یہ بھی ایک مصیبت تھی، کیوں کہ اسے پکنک پر بھی ایک نوکر کی ہی طرح کام کرنا تھا۔

گاڑی پکنک پوائنٹ پر پہنچی تو علی اور نیہا گاڑی سے نکل کر تیزی سے دوڑے تو پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے علی کو ٹکر مار دی۔ وہ لوگ علی کو لے کر اسپتال پہنچے جہاں اس کا طویل آپریشن ہوا، مگر اس کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔ ڈاکٹروں نے علی کی ماں سے کہا کہ علی کو خون کی ضرورت ہے۔ علی کا بلڈ گروپ نیہا اور سلمان دونوں سے ملتا تھا۔ علی کی ماں نے نیہا سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو خون دے، مگر اس وقت نیہا نے صاف انکار کر دیا۔ سلمان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ خون دینے پر راضی ہو گیا۔ کچھ روز بعد علی صحت یاب ہو کر گھر واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کی امی اور بہن کو بھی احساس ہوا کہ سلمان بھی ان کا بھائی اور اس گھر کا ایک فرد ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے سلمان کے ساتھ کبھی ظلم یا زیادتی نہیں کی اور سلمان بھی ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ n

گھر آیا عجیب مہمان

عائشہ رانا...... کراچی

شام کا وقت تھا۔ ٹانی اور مانی ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے تھے کہ گھر کے بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ پاپا نے اپنے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے ٹانی سے کہا۔ بیٹے جا کر دیکھو کون آیا ہے۔ ٹانی نے گیٹ کھولا تو ایک عجیب وغریب ہیئت کا شخص کھڑا تھا۔ ٹانی نے پوچھا۔ جی فرمایئے کس سے ملنا ہے آپ کو۔ گیٹ پر کھڑا شخص بولا۔ اپنے والد کو بتاؤ روفی آیا ہے۔ ٹانی نے اندر آ کر پاپا کو بتایا، کوئی روفی نامی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔ پاپا بولے، میں کسی روفی کو نہیں جانتا۔ خیر اسے اندر بلاؤ۔ ابھی ٹانی مڑا ہی تھا کہ اپنے پیچھے عجیب مہمان کو کھڑا پایا جس نے نیلا ہیٹ پہن رکھا تھا جیسے گھر کے اندر بھی اسے دھوپ لگ رہی ہو۔ بے ترتیب چھوٹی سی داڑھی، کندھوں تک لمبے بال، پونی کی صورت بندھے ہوئے، آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور دھول میں اَٹے ہوئے جوتے اور ساتھ ہی ایک عدد بڑا بیگ جس میں شاید ضرورت کی چیزیں تھیں مگر یہ بیگ بھی مکمل طور پر بند نہیں تھا، اس میں بہت سی پرانی اور موٹی موٹی کتابیں جھانک رہی تھیں۔

پاپا نے بالآخر اسے پہچان ہی لیا۔ وہ شخص پاپا کے آبائی علاقہ میں بچپن کا ہمسایہ تھا اور اب دوسرے شہر سے ان کے گھر کسی ضروری کام سے آیا تھا۔ اس کے بھاری بیگ میں کتابوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے علم وادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ چونکہ امی اپنے خاندان میں کسی شادی میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھیں مگر پاپا ٹانی اور مانی کو گھر پر اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، اب روفی انکل کے آنے سے کچھ مطمئن ہو گئے اور روفی انکل سے کہا جتنے دن رہنا ہو، یہاں رہو مگر ٹانی اور مانی کا اور گھر کا بہت خیال رکھنا اور پھر خود بھی شادی میں شرکت کیلئے چلے گئے۔ کیونکہ روفی نے انہیں بے فکر کر دیا تھا۔

پاپا کے جانے کے بعد مہمان اب صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور سب سے پہلے مانی سے ریموٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ٹی وی پر کارٹون چینل بدل کر خبرنامہ لگا دیا اور پھر بچوں سے کہا۔ کچھ کھانے کو ہے تو میرے لئے لے آؤ۔ امی جانے سے پہلے کھانے کے لیے بہت سی چیزیں بنا کر فریج میں رکھ گئی تھیں۔ کچھ دنوں کیلئے ٹانی نے فریج سے سینڈوچز نکال کر مہمان کو پیش کر دیئے۔

ٹانی اور مانی دونوں بھائی تھے مگر ٹانی بہت معصوم اور سادہ تھا جبکہ مانی بہت ذہین تھا۔ اسے مہمان کی بے تکلفیاں بالکل پسند نہیں آ رہی تھیں۔ مہمان نے اکیلے ہی تمام سینڈوچز چٹ کر لئے اور پھر دونوں بچوں سے ان کی تعلیمی کارکردگی کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔ یہ عجیب مہمان دن بھر صوفے پر بیٹھا رہتا۔ اخبارات پڑھتا یا بیگ سے کوئی موٹی کتاب نکال کر پڑھتا بلکہ دیکھتا رہتا اور ٹی وی کا ریموٹ تو اس نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ ہر وقت چینل بدل بدل کر خبرنامہ دیکھتا رہتا اور بچوں کو بھی خبرنامہ دیکھنا پڑتا۔ مانی کو مہمان انکل ایک آنکھ نہ بھائے۔ ایک ہی دن میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ گھر مہمان انکل کا ہو۔ مانی نے ٹانی سے کہا، تم انکل کی زیادہ تابعداری مت کیا کرو۔ خود تو آرام سے بیٹھے رہتے ہیں اور ہم سے اپنے کام کرواتے رہتے ہیں۔ تم بلاوجہ ان کی موٹی کتابوں اور مطالعے سے متاثر ہو رہے ہو۔ ٹانی معصومیت سے بولا۔ ارے بھئی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔ آخر انکل اتنے بڑے ہیں، اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں، اتنا علم ہے ان کے پاس، ایک موضوع پر گھنٹہ گھنٹہ بولتے رہتے ہیں یقیناً وہ قابل احترام انسان ہیں۔ ٹانی نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ میری بات پر یقین نہ کر کے تم بہت پچھتاؤ گے مگر ٹانی جواباً خاموش رہا۔ مہمان انکل نے بہانے بہانے اور چالاکی سے بچوں سے اپنی بہت خدمت کروائی، خاص طور پر ٹانی سے۔ جب ٹانی اپنا اسکول یونیفارم استری کر رہا ہوتا تو مہمان انکل اپنی شرٹ بھی پکڑا دیتے اور کہتے بس ہلکا ہلکا اسے بھی استری کر دو، زیادہ شکنیں نہیں ہیں اس میں بلکہ میرے کپڑے تو بہت صاف ستھرے اور استری شدہ ہی معلوم ہوتے ہیں، کبھی اخبار پڑھتے پڑھتے ٹانی کو کچن میں جاتے دیکھتے تو کہتے ٹانی بیٹا کیا کر رہے ہو؟ ٹانی معصومیت سے جواب دیتا۔ انکل پانی پی رہا ہوں۔ انکل کہتے، اچھا ذرا چولہا تو جلاؤ۔ ٹانی جھٹ چولہا جلا دیتا، پھر انکل کی آواز آتی، اب ذرا چائے کا پانی چڑھا دو۔ دیکھوں تو تمہیں چائے بنانا آتی ہے یا نہیں، اور پھر بہانے سے چائے بنوا کر خود پی لیتے۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ ٹانی اپنے جوتے پالش کر رہا تھا، انکل بولے یہ میرے جوتوں پر بھی ہلکا ہلکا برش لگا دو۔ ٹانی معصومیت سے انکل کا یہ کام بھی کر گیا مگر مانی کو بہت برا لگا۔ مانی نے ٹانی کو علیحدہ لے جا کر سمجھایا۔ انکل اتنے بڑے ہیں، کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ اپنے کام خود کرنا سنت ہے۔ درحقیقت مہمان انکل نہایت چالاک اور کام چور ہیں، خالی خولی علمیت بگھارتے رہتے ہیں اور بیکار اور ناکارہ چیزیں تحفے میں دے کر ہمیں بیوقوف بناتے ہیں۔ آخر ٹانی کو مہمان انکل کی سچائی جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

ایک دن دونوں بھائی ماہانہ ٹیسٹ کی تیاری کر رہے تھے کہ مہمان انکل نے کہا۔ لاؤ بیٹا میں تمہیں گیس کر کے بتاتا ہوں کہ کون کون سے سوالات امتحانات میں آ سکتے ہیں۔ دونوں بھائی پہلے ہی مہمانداری کر کر کے تھک چکے تھے۔ اس چکر میں ان کی پڑھائی کا خاصا ہرج ہو چکا تھا، خاص طور پر ٹانی کا۔ اس لئے ٹانی جھٹ بولا۔ ہاں ہاں انکل، خاص خاص سوالات پر نشانات لگا دیں جو امتحان میں آ سکتے ہوں۔ مہمان انکل بولے۔ بھئی مجھ سے تو اکثر طلباء وطالبات اہم سوالات پر نشان لگواتے ہیں اور اچھے نمبر لیتے بلکہ امتحان میں ٹاپ بھی کرتے ہیں۔ مانی یہ سن کر طنزیہ بولا۔ اچھا، واقعی؟ اور پھر ٹانی کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا کہ وہ انکل کی بات پر یقین نہ کرے مگر وہ انکل کے لئے چائے بنانے کچن چلا گیا۔ اگلے دن امتحان گاہ میں پیپر دینے کیلئے بیٹھا تو ٹانی کے ہوش اُڑ گئے۔ سوالنامہ دیکھ کر اس نے اپنا سر پکڑ لیا کیونکہ اس نے تو انکل کے لگائے ہوئے نشانات والے سوالات کے جوابات یاد کیے تھے جبکہ امتحانات میں آنے والے سوالات یکسر مختلف تھے۔ ٹانی نے اپنے حواس بحال کئے اور خدا کا نام لے کر اندازے سے جوابات لکھے بلکہ یہ ٹیچر کی محنت کا صلہ تھا جو انہوں نے امتحانات سے پہلے بار بار اسباق یاد کروائے تھے۔ ورنہ فیل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ ٹانی کو مانی کی نصیحت اور مشورہ یاد آنے لگا۔ آج جب وہ اسکول سے گھر آیا تو اس نے مہمان انکل کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مہمان انکل اسے بیوقوف بنا بنا کر اپنے کام کرواتے رہے اور اس حد تک استحصال کیا کہ وہ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

گھر آ کر اس نے مانی کو تمام بات بتائی۔ مانی بولا، میں تمہیں پہلے ہی سمجھاتا تھا، خیر اگر ہم نے اب بھی کچھ نہ کیا تو مزید پریشانی ہو سکتی ہے۔ ٹانی نے حل سوچ لیا اور شام کو انکل سے کہا یہ لیجئے آپ کے گھر سے خط آیا ہے، آپ کی بیوی بہت بیمار ہے۔ انکل نے تار پڑھا تو پریشان ہو کر کہا۔ میں واپس کیسے جاؤں، میرے پاس تو واپسی کا کرایہ تک نہیں۔ یہ سن کر ٹانی اور مانی یک آواز ہو کر بولے۔ اس کی فکر بالکل مت کریں اور پھر دونوں نے اپنا اپنا جیب خرچ نکال کر انکل کو پکڑا دیا جو پاپا جانے سے پہلے انہیں دے کر گئے تھے، یہی نہیں بلکہ ٹانی اور مانی دونوں انکل کو اسٹیشن چھوڑنے بلکہ ریل میں بٹھا کر اس وقت تک کھڑے رہے جب تک ریل چل نہ پڑی۔ ریل چلی تو دونوں بھائیوں نے سکھ کا سانس لیا، پھر امی پاپا کو فون کیا، جلد گھر واپس آ جائیں، انکل واپس جا چکے ہیں۔ پاپا بولے فکر نہ کرو، ہم آج رات تک گھر واپس آ جائیں گے۔



گلابی پتھر

کارنر

فراز علی ...... لاہور

کسی گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا اس کا نام بلال تھا۔ وہ بہت محنتی اور جفاکش تھا، وہ بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے گھر میں ایک بہن اور بوڑھے ماں باپ تھے وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں بیچتا اور گھر کا گزر بسر کرتا، اسی وجہ سے ان کے گھر کا گزارا ہوتا۔ ایک دن بلال جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا، وہ اپنے کام میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے پتہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ اچانک تیز طوفان آیا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، ایک چڑیل اس کے سامنے حاضر ہوئی، خوف کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، حیرت سے پوچھا۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا۔ ”میں ایک چڑیل ہوں، تمہیں میرا کام کرنا ہوگا۔“ لڑکا بولا۔ میں تمہارا کوئی کام نہیں کروں گا۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری بہن میرے قبضے میں ہے، جب تم میرا کام کرو گے تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔“ بلال بولا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ”تمہیں میرے لئے کالی غار سے ایک گلابی پتھر لانا ہوگا، جو میرے لئے بے حد قیمتی اور نایاب ہے۔

لہٰذا لڑکے نے اپنی بہن اقصیٰ کو بچانے کے لئے حامی بھر لی اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ آخرکار وہ اس پہاڑ پر پہنچا، اور غار کی جانب بڑھنے لگا، ڈرتا ڈرتا اس غار میں داخل ہوا اور بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اس پتھر تک پہنچا۔ اس نے وہ پتھر لا کر اس خطرناک چڑیل کو دے دیا اور بدلے میں اپنی بہن اقصیٰ کو چھوڑنے کو کہا۔ چڑیل نے کہا۔ ”میں تمہیں پاگل نظر آتی ہوں، جو اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دوں گی۔“ لڑکا یہ سن کر طیش میں آگیا اور بولا۔ اگر تم نے میری بہن کو نہ چھوڑا تو میں یہ پتھر توڑ دوں گا۔ چڑیل یہ سن کر گھبرا گئی اور کہنے لگی۔ ”نہیں اسے مت توڑنا، میں تمہاری بہن اقصیٰ کو چھوڑ دوں گی۔“ اس نے اقصیٰ کو چھوڑ دیا۔ مگر بلال نے وہ پتھر توڑ دیا اور وہ چڑیل ایک خوبصورت لڑکی میں تبدیل ہو گئی۔ لڑکا یہ دیکھ کر حیران پریشان ہوگیا۔ تب چڑیل جو کہ اب ایک سیدھی سادی خوبصورت لڑکی کے روپ میں بدل چکی تھی بولی۔ ”دراصل میں کوئی چڑیل نہیں بلکہ گاؤں کے زمیندار کی بیٹی ہوں، ایک مکار چڑیل نے مجھے ایسا بنا دیا تھا، تمہارا شکریہ دوست، کہ تم نے مجھے اس چڑیل کے جادو سے آزاد کروا دیا۔“ یہ سب سن کر اقصیٰ، کومل کے پاس چلی آئی اور اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”کومل گھبراؤ نہیں، ہم تمہیں تمہارے بابا کے پاس پہنچا دیں گے اور وہ مکار چڑیل اب کبھی ہمیں تنگ نہ کر سکے گی، یہ سن کر بلال نے بھی اقصیٰ کی تائید کی اور تینوں گاؤں کی جانب بڑھنے لگے، کومل کو اس کے والدین کے گھر پہنچانے کے بعد دونوں بہن بھائی بھی اپنے گھر لوٹ آئے اور ایک بار پھر محنت مزدوری کر کے خوشی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

گڑیوں کی باتیں

نازنین فاطمہ۔ کراچی

گڑیا گڈے اور کھلونے ہر بچے کو پسند ہوتے ہیں جن سے وہ بہت شوق سے کھیلتے اور خوش ہوتے ہیں۔ سات سالہ فاطمہ کے پاس بھی بہت سی گڑیاں تھیں جن سے وہ خود بھی کھیلتی تھی اور اس سے چھوٹی بہن اور بھائی بھی کھیلتا تھا۔ فاطمہ کے تایا اور چچا کے بچے بھی ان کے گھر آتے تو سب مل کر کھیلتے تھے، لیکن فاطمہ ان سب سے بڑی تھی۔ وہ سب کی لاڈلی تھی اور اس کی سالگرہ بھی بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ سالگرہ پر اسے بہت سے تحفے ملتے تھے جن میں بہت پیاری پیاری گڑیاں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں سے فاطمہ کو تین گڑیاں بہت پسند تھیں ۔ فاطمہ نے ان کے نام بھی رکھ دیے تھے: ڈولی، وینی اور جولی تھا۔ جب سب بچے ایک ساتھ کھیلتے تو فاطمہ دوسرے کھلونوں کے ساتھ اپنی گڑیاں بھی نکال لیتی اور سب بچے مل کر ان سے کھیلتے تھے۔ رات کو جب سب گھر والے سو جاتے تو تمام کھلونے اور گڑیاں آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اس روز بھی وہ اسی طرح باتیں کر رہے تھے۔

ڈولی کہہ رہی تھی: ”مجھے فاطمہ کے تایا کے بچے بالکل اچھے نہیں لگتے۔“

وینی نے کہا: ”وہ کیوں؟“

درمیان میں ڈولی بولی: ”وہ ہر بار مجھے بہت مارتے ہیں اور آج تو حد ہی ہو گئی، فاطمہ کے تایا کے بیٹے نے میرے منہ پر زور زور سے تھپڑ بھی مارے۔“

جولی نے کہا: ”ہاں! آج اس نے میرے بال بھی نوچے تھے۔“

وینی نے کہا: ”میرا بس چلے تو انھیں کھیلنے ہی نہ دوں۔ مجھے بہت غصہ آرہا ہے کہ ان لوگوں نے تمھیں اتنا تنگ کیا ۔ میں تو الماری میں ہی رہ گئی تھی، اس لیے بچ گئی ورنہ وہ مجھے بھی تنگ کرتے۔“

ڈولی کہنے لگی: ”لیکن فاطمہ تو بہت اچھی ہے۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتی ہے۔ پتا ہے آج وہ اپنی امی سے کہہ رہی تھی کہ جب سب بچے جمع ہوا کریں گے تو میں اپنی گڑیاں نہیں نکالوں گی۔ مگر اس کی امی نے اسے سمجھایا کہ بچے ہیں، کھیل کر اپنے گھر چلے جائیں گے۔“

وینی نے کہا: ”فاطمہ تو اچھی ہے، لیکن اس کی چھوٹی بہن مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ اس نے آج مجھے بہت زور سے اٹھا کر پھینکا تھا۔ میرے سر میں چوٹ آئی ہے۔“

جولی نے کہا: ”وینی! وہ بری نہیں ہے، بس آج وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی تو اس کی امی نے اسے ڈانٹا، اسی لیے اسے غصہ تھا۔“

ڈولی کہنے لگی: ”میں نے فاطمہ کی امی کو باتیں کرتے سنا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ گھر کے سب بڑے کل کہیں جا رہے ہیں، گھر میں صرف بچے ہوں گے، اور فاطمہ کے ماموں کے بچے بھی کل یہیں ہوں گے۔“

جولی بولی: ”اب ہم کیا کریں؟ کل کا دن تو بہت برا گزرے گا۔ اللہ خیر کرے۔“

وینی کہنے لگی: ”ارے جلدی سے سب الماری میں واپس چلو۔ کوئی آرہا ہے۔“ پھر وہ سب تیزی سے بھاگ کر الماری میں واپس چلی گئیں۔

دوسرے دن سب بچے گھر میں جمع تھے۔ فاطمہ کے ماموں کے بچے بھی اپنے کھلونے ساتھ لائے تھے۔ سب اپنے اپنے کھلونوں سے کھیلنے لگے ۔ آج فاطمہ کے تایا کی بیٹی ایک بڑی سی گڑیا لائی تھی۔ سب بچے اس سے کھیل رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فاطمہ کے ماموں کی بیٹی نے اس گڑیا کا ہاتھ توڑ دیا اور ان کی آپس میں لڑائی ہونے لگی ۔ پھر کیا تھا، سب بچے ایک دوسرے کے کھلونے توڑنے لگے اور ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ اسی دوران گھر کے بڑے آگئے اور سب بچوں کو خوب ڈانٹ پڑی۔ پھر سب مہمان بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وینی نے ڈولی اور جولی سے کہا: ”سب چلے گئے ہیں، الماری سے باہر آجاؤ۔“

وہ دونوں الماری سے باہر آگئیں۔ ڈولی بولی: ”آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔“

وینی کہنے لگی: ”ایک بچے نے میرا ہاتھ بہت زور سے مروڑا۔ بہت درد ہو رہا ہے۔“

ڈولی نے کہا: ”ہاں ایک بچہ تو میری آنکھوں میں پینسل کی نوک چبھو رہا تھا۔ دیکھو میرے منہ پر پینسل کے کتنے نشان ہیں۔“

وینی روتے ہوئے بولی: ”ایک بچی تو میرے اوپر بیٹھ گئی تھی۔ میرا سانس رکنے لگا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ فاطمہ کی چھوٹی بہن نے مجھے بچا لیا۔“

جولی کہنے لگی: ”دیکھا وینی! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ فاطمہ کی چھوٹی بہن اتنی بری نہیں ہے۔“

ڈولی نے کہا: ”یہ بچے اتنے بدتمیز کیوں ہیں، حالاں کہ یہ اتنے اچھے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اسکول میں تو اچھی اچھی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ ہم گڑیاں اسکول نہیں جاتیں پھر بھی کسی بچے کو تنگ نہیں کرتیں۔“

جولی نے کہا: ”سب بچے بدتمیز نہیں ہوتے۔ ان میں سے بہت سے اچھے ہوتے ہیں۔ اگر دوسرے خراب بچے بھی فاطمہ کی طرح اچھے ہو جائیں اور کسی کو تنگ نہ کریں تو ہم انھیں برا بھلا کہنے کے بجائے ان کی تعریف کریں۔“

وینی بولی: ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج تو میں فاطمہ کی امی کی باتیں سن کر بہت خوش ہوئی ہوں۔“

ڈولی نے پوچھا: ”اچھا! کیا کہا ہے انھوں نے؟“

وینی نے کہا: ”فاطمہ اپنی امی سے کہہ رہی تھی کہ اگلی بار جب سب بچے آئیں گے تو وہ اپنی گڑیاں نہیں نکالے گی، صرف اپنے بہن بھائی کو کھیلنے کے لیے دے گی۔ اس پر فاطمہ کی امی نے کہا ”ٹھیک ہے میں بھی نہیں چاہتی کہ تمھاری گڑیاں اور کھلونے کوئی بچہ توڑے اور آج سے تمھاری گڑیاں اوپر والے شوکیس میں رکھ دوں گی، تاکہ کوئی بچہ ان کو ہاتھ نہ لگا سکے۔“

ڈولی اور جولی خوشی سے تالیاں بجانے لگیں کہ اب ہم صرف اچھے بچوں کے ساتھ کھیلیں گی اور بدتمیز اور تنگ کرنے والے بچے ہمارے پاس کبھی نہیں آسکیں گے۔ ☆

حیرت انگیز تحفہ

حفصہ حسن۔ شیخوپورہ

حریم اور میرا بچپن ایک ساتھ گزرا، لیکن جب ان کی فیملی دوسرے شہر چلی گئی تو ملاقاتیں تو نہ ہو سکیں، لیکن رابطہ ختم نہ ہوا۔ جب بورڈ کا رزلٹ آیا تو میری نمایاں پوزیشن تھی۔ اتفاق سے حریم کی پوزیشن بھی بورڈ میں میری طرح گولڈ میڈل والی تھی، لیکن اس کا بورڈ دوسرا تھا۔

ایک دن میں نے اپنی ای۔ میل چیک کی تو اس میں حریم کی طرف سے مبارک باد اور لاہور آنے کی دعوت دی تھی ۔میں نے میل پڑھی اور کاموں میں لگ گئی۔ پھر ٹی سی ایس کے ذریعے ایک لفافہ آیا جس میں حریم کی طرف سے دعوت نامہ تھا کہ دس مئی کو اس کی سال گرہ ہے جس میں اس نے تمام کلاس فیلوز کو بلایا ہے۔

میں نے حریم کے لیے ایک تحفہ خریدا اور اسے مزید خوب صورت بنایا۔ رات کو ہم حریم کے گھر پہنچے۔ وہاں بڑی رونق اور ہلا گلا تھا۔ مہمانوں کی تواضع عمدہ کھانوں سے کی گئی۔ پھر سب نے کیمروں کی فلیش لائٹس میں حریم کو تحائف دیے جس میں جیولری سے لے کر لیپ ٹاپ تک سب شامل تھا۔ اس دوران میری ایک اسکول فیلو اسماء میرے پاس آئی، لیکن اسے مجھے اسٹیج پہ بلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ حریم بہت خوش تھی اور ہیلو ہائے اور شکریہ کے ساتھ تحفے وصول کر رہی تھی۔ اچانک اس نے مجھے آواز دی۔ میں اپنے تحفے سمیت اسٹیج کی طرف گئی تو میں نے حاضرین سے کچھ کہنے کی اجازت مانگی اور کہنا شروع کیا:

”حریم میری بہت اچھی دوست ہے۔ ذہانت اور سخاوت اسے ورثہ میں ملی ہے۔ بہت خوب صورت اور خوب سیرت ہے، بلکہ ایک تحفۂ خداوندی ہے۔ مجھے کوئی تحفہ ایسا نظر نہ آیا جو میری سہیلی کے شایان شان ہو، اسی لیے میں یہ تحفہ لائی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے آئینہ نکال کر حریم کے سامنے کر دیا جس پر حریم پہلے حیران ہوئی ، پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ اسی دوران عشاء کی اذان ہوئی تو میں اپنے گھر چلی آئی۔ وہ آئینہ ایک تحفہ نہ تھا، بلکہ خلوص کے ساتھ دیا ہوا وہ جذبہ تھا جس کی ہمیں آج بہت ضرورت ہے۔ n



ایک کنجوس آدمی بارش میں چھتری کو بغل میں دبا کر جا رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا۔ "بھئی چھتری کیوں نہیں کھول لیتے؟"

کنجوس آدمی نے جواب دیا۔ بارش میں بھیگ جائے گی۔

☆......☆......☆

ایک چور تار کی مدد سے ایک گھر کا تالا کھول رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد تالا کھل گیا۔ عین اسی وقت مالک مکان بھی آ گیا، اسے دیکھ کر چور گھبرا گیا وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ مالک مکان نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور کہا "گھبراؤ نہیں، میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں، کیونکہ اس تالے کی چابی مجھ سے کھو گئی تھی۔"

☆......☆......☆

جج (ملزم سے) "تمہیں پانچ آدمیوں نے چوری کرتے ہوئے دیکھا اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ یہ غلط ہے۔"

ملزم۔ "جج صاحب! میں آپ کو ایسے پانچ سو آدمی دکھا سکتا ہوں، جنہوں نے مجھے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

☆......☆......☆

محکمۂ ڈاک کا ایک ملازم ریٹائر ہوا تو اس کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب کے اختتام پر پوسٹ ماسٹر جنرل نے اس سے پوچھا۔ "تم نے اتنے عرصے یہاں کام کیا، تمہارا ذاتی تجربہ کیسا رہا؟"

ملازم نے کہا۔ "بہت اچھا رہا، لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ میری پنشن کی رقم بھی ڈاک سے مت بھجوائیے گا۔"

☆......☆......☆

ایک کاریگر شہر کے چوراہے میں لگے ہوئے گھنٹے کی مرمت کر رہا تھا۔ جب وہ اسے ٹھیک کر چکا تو پسینے میں شرابور سیڑھی سے نیچے اترا۔

ایک صاحب بڑی دیر سے اسے گھنٹہ ٹھیک کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیوں بھائی! کیا گھنٹہ خراب ہو گیا تھا۔"

کاریگر جھنجھلا کر بولا۔

"جی نہیں! میری آنکھیں کمزور ہیں، وقت دیکھنے کے لئے اوپر چڑھا تھا۔"

☆......☆......☆

ساجد نے اپنے دوست واحد سے کہا۔ "میں نے شہر میں چوری کی بڑھتی ہوئی وارداتوں سے تنگ آ کر پولیس کو درخواست بھیجی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" واحد نے تجسس سے پوچھا۔

"جواب آیا کہ آپ کی درخواست فائل سے چوری ہو گئی ہے، دوسری درخواست بھیجئے۔" ساجد نے کہا۔

☆......☆......☆

استاد (ادریس سے) "امریکا کہاں واقع ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" ادریس نے جواب دیا۔

استاد نے کہا، اچھا تو پھر ڈیسک پر کھڑے ہو جاؤ۔"

"تو کیا امریکا نظر آ جائے گا؟" ادریس نے پوچھا۔

☆......☆......☆

مالک (نوکر سے) "تم جس کام سے بھی جاتے ہو، دو یا تین گھنٹوں کے بعد واپس آتے ہو، آخر کیوں؟"

نوکر۔ "صاحب! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بجلی کی طرح کام کیا کرو۔"

(راحیل نور احمد......سیالکوٹ)

ہاتھی سب کا دوست

محمد عماد بیگ

کسی جنگل میں گولو نام کا ایک ہاتھی رہتا تھا۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا تھا۔ وہ جنگل کے جانوروں سے دوستی کرنا چاہتا تھا، مگر جانور اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار گولو نے طے کیا کہ وہ کسی نہ کسی جانور سے دوستی ضرور کرے گا۔

یہ سوچ کر وہ جنگل میں چل پڑا، سب سے پہلے اس کی نظر ایک بندر پر پڑی جو درخت پر بیٹھا تھا۔

''مجھ سے دوستی کرو گے؟'' گولو ہاتھی نے بندر سے پوچھا۔

''نہیں بابا، تم بہت بڑے ہو، میری طرح نہ تو درختوں پر چڑھ سکتے ہو اور نہ ہی شاخوں سے لٹک کر جھولا جھول سکتے ہو۔''

گولو ہاتھی مایوس ہو کر آگے بڑھا تو راستے میں ایک خرگوش دکھائی دیا۔ گولو نے اس سے بھی دوستی کرنے کو کہا تو خرگوش نے جواب دیا: ''تم بہت بڑے ہو، میرے بھٹ میں میرے ساتھ نہیں کھیل سکتے، اس لیے ہماری دوستی نہیں ہو سکتی۔''

مایوس گولو ہاتھی آگے بڑھا تو اس کی نظر مینڈک پر پڑی۔ گولو نے اس سے بھی یہی بات کہی تو مینڈک نے جواب دیا: ''تم اتنے لمبے چوڑے ہو، میری طرح چھلانگ نہیں لگا سکتے۔ میں تمہارا دوست نہیں بن سکتا۔''

پریشان گولو آگے بڑھا تو اسے لومڑی ملی۔ گولو نے لومڑی سے دوستی کرنی چاہی تو اس نے جواب دیا: ''جناب گولو صاحب! میں برابر والے سے دوستی کرنا پسند کرتی ہوں، آپ پہلے ہی بہت بڑے ہیں، میری اور آپ کی دوستی کیسے ہو سکتی ہے!''

گولو ہاتھی مایوس اور دکھی ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اگلے روز وہ صبح سو کر اٹھا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جنگل کے سبھی جانور خوف کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ گولو ہاتھی نے ایک ریچھ کو بڑی مشکل سے روکا اور اس سے پوچھا: ''کیا بات ہے؟ کیا اس جنگل میں کوئی بلا گھس آئی ہے جو تم سب خوف زدہ ہو کر بھاگے چلے جا رہے ہو؟''

ریچھ نے لرزتے ہوئے جواب دیا: ''گولو! ہمارے جنگل میں دوسرے جنگل کا ایک شیر آ گیا ہے، وہ بہت بھوکا ہے، ہمارے جانوروں کو مسلسل ہڑپ کیے جا رہا ہے۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔''

یہ کہہ کر ریچھ ایک طرف بھاگتا چلا گیا۔ گولو ہاتھی حیران پریشان کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مشکل وقت میں جانوروں کی مدد کے لیے کیا کرے۔ اس دوران شیر اپنا کام کرتا رہا، اس کے سامنے سے گزرنے والا ہر جانور اس کے پیٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد گولو ہاتھی سیدھا شیر کے سامنے پہنچا اور اس سے کہا: ''شیر جی! آپ نے جنگل میں یہ کیسی دہشت پھیلا رکھی ہے۔ آپ اس جنگل کے غریب جانوروں کو کھائے جا رہے ہیں۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟''

''اپنے کام سے کام رکھو۔'' شیر نے غراتے ہوئے کہا۔

گولو ہاتھی کو شیر کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ اٹھائی اور شیر کو مارنی چاہی تو وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، وہ جانتا تھا کہ ہاتھی کی لات اس کا کیا حشر کرے گی۔

اب ہاتھی نے جنگل میں آ کر اعلان کیا: ''میرے پیارے دوستو! ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس ظالم شیر کو جنگل سے بھگا دیا ہے۔ باہر آ جاؤ۔''

تمام جانور ایک ایک کر کے اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے کہا: ''گولو! تم بہت اچھے جانور ہو۔ تم لمبے چوڑے ہو تو کیا ہو، ہم بڑے فخر سے تم سے دوستی کریں گے۔''

گولو ہاتھی نے اپنی سونڈ اٹھا کر خوشی کا اظہار کیا، جانوروں نے بھی خوشی کا نعرہ لگایا اور اس دن سے تمام جانور اس کے دوست بن گئے۔ n

ہاتھی کی سونڈ

بلال بابر۔ کراچی

ننھا ہاتھی اپنی امی (ہتھنی) کے ساتھ کیسی بے فکری اور خوشی سے چلا جا رہا ہے۔ جب امی ساتھ ہوں تو کیسا ڈر؟ نہ کسی جانور کا ڈر ہے اور نہ کسی اور چیز کا۔ اسے معلوم ہے کہ امی اسے ہر مشکل اور ہر پریشانی سے بچا لیں گی اور اس کی طرف بڑھنے والے کی خوب پٹائی بھی کریں گی۔ مگر جس طرح انسان کے بچوں کو اپنی ماں کے پیار کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح جانوروں کے بچوں کو بھی اپنی ماں کے پیار اور اس کی شفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور سے ہتھنی اپنے بچے سے پیار کرنے کے لیے اپنی سونڈ استعمال کرتی ہے۔ جب ہتھنی اور اس کا بچہ کہیں جا رہے ہوں تو ہتھنی اپنی سونڈ کے ذریعے اسے صحیح سمت میں چلاتی ہے۔ اگر وہ راستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر ہوتا ہے تو ہتھنی ہی اس کو صحیح راستے پر لے جاتی ہے۔ اس دوران وہ بار بار اپنی سونڈ کے ذریعے اپنے بچے کو آگے دھکیل کر یا دھکا دے کر اس کی راہ نمائی کرتی ہے کہ اسے کدھر جانا ہے۔ اگر راستہ چلتے ہوئے ننھا منا ہاتھی گر جائے یا لڑکھڑا جائے تو ہتھنی اپنی سونڈ کے ذریعے اسے سہارا دے کر دوبارہ اس کے قدموں پر کھڑا کرتی ہے اور پھر پیار سے آگے بڑھاتی ہے۔ سونڈ کے ذریعے ہی ہتھنی اپنے بچے کو نہلاتی ہے، اس کے ذریعے اس پر پانی ڈالتی ہے اور اس کے جسم کی صفائی کرتی ہے۔ گویا سونڈ ہتھنی کے ہاتھ ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور پیار اور شفقت سے اسے تھپکیاں بھی دیتی ہے۔ ■

ہوم ورک

نرگس عامر۔ کورنگی

ہر شام نسرین کے گھر میں خوب رونق ہوتی تھی، اس کی وجہ محلے بھر کے وہ بہت سے بچے تھے جو اس کے پاس ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ نسرین صرف انھیں پڑھاتی ہی نہیں تھی، بلکہ انہیں بہت اچھی اچھی باتیں بھی سکھاتی تھی۔ سبھی بچے نسرین کو باجی کہتے تھے۔ نسرین خود بھی کالج میں پڑھ رہی تھی، مگر پھر بھی وہ اپنے محلے کے ان بچوں کو پڑھانے کی کوئی فیس نہیں لیتی تھی۔ بچے روزانہ پڑھنے کے دوران ہی اپنی پینسلیں بھی شارپ کرتے تھے جس کا اچھا خاصا کوڑا جمع ہو جاتا تھا۔ بعض بچے کاپی یا کتاب کا کوئی صفحہ پھاڑ دیتے، کبھی ٹافیاں کھاتے اور سارے صحن میں کچرا پھیلا دیتے۔ مگر نسرین ان کی ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ لیکن جب یہ سلسلہ بہت زیادہ بڑھ گیا تو ایک روز نسرین نے ان سب بچوں کو بڑے پیار سے سمجھایا کہ اس طرح ادھر ادھر کچرا پھینکنا اچھی بات نہیں، کچرا ہمیشہ ڈسٹ بن میں ہی پھینکنا چاہیے۔ بچوں نے نسرین کی بات کو توجہ سے سنا اور فوراً ہی سارا کوڑا کرکٹ اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ حمزہ بھی نسرین کے پاس پڑھنے آتا تھا۔ وہ بہت اچھا بچہ تھا۔ اسے جو بھی ہوم ورک ملتا، وہ ہمیشہ وقت پر مکمل کرتا تھا۔ بلال بھی نسرین کے پاس پڑھنے آتا تھا، مگر اسے جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ ایک روز نسرین نے بلال کی کاپیاں چیک کیں تو اسے پتا چلا کہ بلال نے اپنا ہوم ورک پورا نہیں کیا ہے۔ نسرین نے جب اس سے وجہ پوچھی تو بلال نے معصوم سی صورت بناتے ہوئے کہا: "باجی! میرا بڑا بھائی مجھے تنگ کرتا ہے۔ کل رات میں ہوم ورک کر کے سویا تو اس نے موقع پاتے ہی چپکے سے میرا سارا ہوم ورک مٹا دیا، تاکہ مجھے ڈانٹ پڑے اور سب مجھے نالائق سمجھیں۔"

لیکن نسرین کو بلال کی اس بات پر بالکل یقین نہ آیا، کیوں کہ کاپی کے صفحوں کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ ان پر کچھ لکھا ہی نہیں گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ بلال خود کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔

اس نے بلال سے کہا: "میں جانتی ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس لیے تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اپنے دونوں کان پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

بلال اپنا سا منہ لیے کان پکڑ کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ نسرین نے ساری کاپیاں چیک کرنے کے بعد بلال کی طرف دیکھا، وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ نسرین کو اس پر ترس آنے لگا۔ پھر اس نے بلال کو پیار سے سمجھایا: "دیکھو بلال! جھوٹ بولنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اللہ بھی پسند نہیں کرتا۔ پھر بات بے بات جھوٹ بولنے سے یہ عادت بہت پختہ ہو جاتی ہے۔ جھوٹ بولنے والے بچوں کو کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی ان کی کسی بات کا اعتبار کرتا ہے۔ اب تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔"

یہ سن کر بلال بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے نسرین سے وعدہ کیا کہ اب میں ہمیشہ سچ بولوں گا۔ پھر اس نے نسرین کو ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا: "باجی! آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ اصل میں کل میں گلی میں دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا تھا۔ پھر شام کو گھر واپس آیا تو ٹی وی پر میرا فیورٹ پروگرام آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے بیٹھ گیا اور ہوم ورک نہیں کر سکا۔"

نسرین نے غور سے بلال کو دیکھا۔ اس نے آج سچ بولا تھا اور اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ نسرین کو یہ بات بہت پسند آئی تھی۔ اس نے بلال کو تاکید کرتے ہوئے کہا: "آئندہ تم ایسی بے پروائی ہرگز نہ کرنا اور اپنا ہوم ورک ہمیشہ وقت پر کرنا، ورنہ میں سزا دینے میں کوئی رعایت نہیں کروں گی۔ سمجھ گئے؟"

بلال کے ساتھ باقی سب بچوں نے بھی نسرین کی باتوں کو بہت توجہ سے سنا اور یہ عہد کر لیا کہ وہ بھی اسکول اور ٹیوشن کا سب کام وقت پر مکمل کریں گے۔n

حورب کی بہادری

ثناء اکرم۔ کوٹ راجہ، سرگودھا

حورب کو پھول بہت پسند تھے، اسی لیے وہ روز اسکول آتے جاتے سڑک کنارے لگے پھولوں کو رک کر دیکھتی اور بہت خوش ہوتی تھی۔ حورب نہ تو خود پھول توڑتی اور نہ کسی اور کو توڑنے دیتی تھی، اسی لیے پھول بھی حورب کے دوست بن گئے تھے۔ وہ جب بھی اپنی انگلیوں کی پوروں سے پھولوں کو چھو کر محسوس کرتی تو پھول بہت خوش ہوتے اور جھوم جھوم کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

آج بھی اسکول سے واپسی پر حورب پھولوں کے پاس کھڑی تھی کہ اسے قریبی جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ پہلے تو اس نے اسے نظرانداز کیا مگر جب آواز دوبارہ آئی تو تجسس سے حورب آگے بڑھی اور ان آوازوں کو غور سے سننے لگی۔

ایک آواز آرہی تھی: "اب اس اسکول کی سیکیورٹی بہت اچھی ہوگئی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہم اسی سڑک کے کنارے دبادیں تو بھی ان کا کافی نقصان ہو سکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ بچے پیدل آتے جاتے ہیں۔"

دوسری آواز نے کہا: "ہاں اعجاز ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ بچے ہی بڑے ہو کر ہمارے لیے مسائل پیدا کریں گے۔ اگر یہ پڑھ لکھ گئے تو ہمارا یہاں رہنا مشکل بنادیں گے۔"

حورب کو یہ باتیں سن کر پسینہ آگیا۔ وہ سوچنے لگی: "اب یہ لوگ میرے اسکول کے بچوں کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" یہ سوچتے ہی حورب نے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ وہ جتنا تیز بھاگ سکتی تھی، بھاگی۔ یہ سچ ہے کہ آج سے پہلے حورب کبھی اتنا تیز نہیں دوڑی تھی۔ مگر آج اسے وطن کی مٹی نے پکارا تھا، اسی لیے اس کے قدم غیر معمولی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

پھولے ہوئے سانس کے ساتھ جب وہ گھر پہنچی تو امی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں اور بولیں: "بیٹا! کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے ناں؟ تمہارا سانس کیوں پھول رہا ہے؟" امی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے، مگر حورب کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ امی نے جلدی سے حورب کو پانی پلایا۔ جب اس کا سانس قابو میں آیا تو اس نے امی کو پوری بات بتادی اور کہا: "امی! جلدی سے پولیس اسٹیشن کال کریں، ایسا نہ ہو کہ......"

امی جلدی سے بولیں: "نہیں بیٹا، انشاءاللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہر بار کامیاب ہوں گے؟ یہ بار بار وار کریں گے اور ہم ہر بار سہہ لیں گے، اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن فون کرتی ہوں، تم فکر نہ کرو۔"

یہ کہتے ہوئے امی نے جلدی سے پولیس اسٹیشن کال کر کے ساری صورت حال بتائی اور پھر ایک گھنٹے بعد پولیس دہشت گردوں کے اس گروپ کو گرفتار کر چکی تھی جو اس اسکول کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ حورب کو اس بات کی خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے شہر کو ایک بڑی تباہی سے بچالیا تھا۔n

اس شاپر میں کیا ہے؟

نرگس عامر۔ کورنگی، کراچی

ندا کے ابو جب گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ ندا نے جیسے ہی انھیں دیکھا، جھٹ بھاگ کر ان کے پاس آئی اور بولی: ''ابو! آپ اس شاپر میں میری گڑیا لائے ہیں ناں؟ میری گڑیا کی ٹانگ جو ٹوٹ گئی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں ابو؟''

ندا کے ابو ابھی اس کی بات سن ہی رہے تھے کہ ندا کا بھائی حمزہ بھی کمرے سے چیختا ہوا آیا اور بولا: ''جی نہیں، ابو تمہارے لیے گڑیا کیوں لائیں گے؟ تمہیں یاد نہیں کل میں نے ٹیسٹ میں بہت اچھے نمبرز لیے تھے، اسی لیے ابو میرے لیے ریموٹ سے چلنے والی کار لائے ہوں گے۔ ہے ناں ابو؟'' اس نے تصدیق کرنے کے لیے ابو کی طرف دیکھا، مگر ابو خاموش تھے۔ انہوں نے حمزہ کی پوری بات سنی اور کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ اتنے میں حمزہ اور ندا کی امی کچن سے برآمد ہوئیں اور بڑے جوش کے عالم میں کہنے لگیں: ''ارے! آپ آگئے اور آپ کے ہاتھ میں یہ شاپر، اس میں کیا ہے؟''

ندا کے ابو خوش ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور بولے: ''ارے بیگم، وہ میں...'' لیکن ندا کے امی نے فوراً ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ''ہاں یاد آیا، آپ میرے لیے نیا سوٹ لائے ہوں گے۔ ابھی تین روز پہلے ہی تو میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ میرے سارے سوٹ پرانے ہوگئے ہیں، حیرت ہے کہ آپ کو میری بات یاد رہی۔''

یہ سن کر ندا کے ابو ایک لمحے کے لیے جھنجلا گئے اور غصے کے عالم میں بولے: ''کیا مصیبت ہے! تم لوگ خود ہی قیاس آرائیاں کرتے رہو گے یا میری بھی کچھ سنو گے؟ میں کچھ بول سکتا ہوں یا نہیں؟''

''جی کہیے!'' ندا، حمزہ اور ان کی امی تینوں ہم ایک ساتھ بولے اور پھر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

ندا کے ابو تھوڑی دیر رکے اور پھر بولے: ''بھئی، بات دراصل یہ ہے کہ آج آفس سے جلدی چھٹی ہوگئی تھی، اسی لیے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ذرا مارکیٹ تک چلا گیا تھا۔ اسے وہاں کچھ خریداری کرنی تھی۔ بس وہاں مارکیٹ میں چلتے پھرتے میری نظر جوتوں کی ایک دکان پر پڑی تو مجھے اچانک خیال آیا کہ میرے موجودہ جوتے بہت گھس چکے ہیں اور اب تو انھیں پہنتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ بس پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج اپنے لیے نئے جوتے خرید ہی لوں، ورنہ جب بھی خریدنے کا ارادہ کیا، ہر بار ہی مصروفیت کے باعث بات آئی گئی ہوگئی۔ بس یہ سوچتے ہی میں نے اپنے لیے نئے جوتے خرید لیے اور اس شاپر میں وہی جوتے ہیں۔''

''اچھا!'' ندا، حمزہ اور ان کی امی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور پھر وہ سب منہ لٹکائے ادھر ادھر کھسک گئے۔ ندا اور حمزہ واپس کمرے میں جاکر اپنا ہوم ورک کرنے لگے اور ندا کی امی دوبارہ کچن میں جاکر مصروف ہوگئیں۔ جیسے ہی ندا کے ابو پانی پینے کچن میں آئے اور انہوں نے فریج کا دروازہ کھولا تو بولے: ''ایسا لگتا ہے کہ آج تمہیں میرا خیال آہی گیا، جبھی آج میری پسند کا کھانا بھی بنایا ہے۔ بڑی زبردست قسم کی خوشبو آرہی ہے، بھئی میری تو بھوک چمک گئی ہے۔ کتنی دیر ہے کھانا تیار ہونے میں؟'' ندا کی امی کا موڈ تو پہلے ہی خراب ہوچکا تھا، وہ ذرا روکھے لہجے میں بولیں: ''بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی تو نظر آتے ہیں ناں۔ جو بھی پکایا ہے، تھوڑی دیر میں سامنے آجائے گا۔'' اپنی بیوی کی بات سن کر ندا کے ابو ہکا بکا سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ n

جب لومڑی کو سزا ملی

محمد علیم نظامی۔ لاہور

ایک سارس اور ایک لومڑی میں بڑی پکی دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ نہ جانے ایک روز کیا ہوا کہ لومڑی کے دل میں برائی آگئی اور اس نے سوچا کہ کسی طرح سارس کی بے عزتی کی جائے۔ چناں چہ اس نے سارس سے کہا: "بھائی سارس! کل تمہاری میرے گھر میں دعوت ہے۔ کل کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔"

سارس نے کہا: "بی لومڑی! آپ کا بہت بہت شکریہ! میں ضرور آؤں گا۔"

دوسرے روز سارس، لومڑی کے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ لومڑی نے چوڑی چوڑی پلیٹوں میں شوربے والا سالن پکا کر رکھا ہوا ہے۔ لومڑی کے لیے تو ان پلیٹوں میں سے یہ شوربے والا سالن کھانا کچھ بڑی بات نہ تھی، مگر بے چارہ سارس کیا کرتا! وہ اپنی لمبی چونچ سے پلیٹ میں ٹھونگیں مارنے لگا، مگر کچھ بھی پلے نہ پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ لومڑی تو سارا سالن چٹ کر گئی اور سارس بھوکا ہی رہا۔

جب کھانا ختم ہوگیا تو لومڑی نے سارس کو مخاطب کیا: "کیوں بھائی سارس! تم نے پیٹ بھر کے بھی کھایا یا تکلف ہی میں رہے؟ سالن اچھا تھا ناں؟"

سارس نے جواب دیا: "بی لومڑی! آپ نے کھانا کھلایا، آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ! اب آپ کو کل میرے گھر آنا ہے، آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گی۔"

لومڑی نے مسکراتے ہوئے یہ دعوت قبول کرلی اور دوسرے روز سارس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ کھانا بہت مزے دار ہوگا، میں خوب ڈٹ کر کھاؤں گی؟

سارس نے بھی کھانے کے لیے شوربے والا سالن ہی تیار کیا تھا، لیکن اسے چھوٹے اور تنگ منہ کے برتنوں میں ڈال کر مہمان کے سامنے پیش کیا۔ جب دونوں کھانے لگے تو سارس نے برتن میں اپنی لمبی چونچ ڈال کر آرام سے شوربے والا سالن پینا شروع کر دیا، لیکن لومڑی چوں کہ اپنا منہ برتن میں ڈال ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے وہ برتن کی طرف گردن اٹھا کر دیکھتی اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ اس طرح سارس نے لومڑی کو اس کی چالاکی کی سزا دی اور لومڑی شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ ☆

جب وہ راستہ بھٹک گیا

رانیہ خالد۔ راولپنڈی

ایک بار پانچ دوستوں نے شکار کے لیے ایک گھنے جنگل میں جانے کا پروگرام بنایا۔ انہیں ہمیشہ سے جنگل میں شکار کھیلنے کا بہت شوق رہا تھا۔ وہ پانچوں شکار کرنے کے لیے اپنے ساتھ اپنے اپنے تیر کمان بھی لے کر جا رہے تھے، مگر ان کو اس خطرے کا بالکل علم نہیں تھا جو اس ویران جنگل میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ پانچوں جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ پرندوں کا شکار کرنے کے بعد وہ تھک گئے، کیوں کہ انہیں کوئی بڑا جانور شکار کے لیے نہیں مل رہا تھا کہ جس کا شکار کر کے وہ اپنی ہمت کا مظاہرہ بھی کر سکیں اور انہیں اطمینان بھی ہو جائے کہ انہوں نے کوئی بڑا کام کیا۔

ان میں سے ایک شکاری نعمان کہہ اٹھا: ”ہم تو جانوروں کا شکار کرنے آئے تھے، مگر ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کو کیوں نشانہ بنا رہے ہیں؟“

کچھ سوچنے کے بعد دوسرا شکاری عادل بولا: ”ہاں، تم صحیح کہہ رہے ہو۔ آؤ کسی بڑے جانور کو ڈھونڈ کر اس کا شکار کرتے ہیں۔“

چناں چہ وہ سب آگے کی طرف چل دیے، لیکن جیسے ہی وہ کچھ فاصلے پر گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے شیر کے سامنے پایا۔ شیر کی دہاڑ سنتے ہی پانچوں دوستوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ موقع ملتے ہی وہ تمام سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چوں کہ وہ مختلف سمتوں میں بھاگ رہے تھے، اس لیے شیر نے ان میں سے صرف نعمان کا تعاقب کیا اور باقی کو نظر انداز کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے نعمان جنگل کے درمیان میں آ پہنچا۔ اس نے پیچھے دیکھا تو شیر کا نام و نشان نہ تھا۔ اس نے تھوڑی دیر سکون کا سانس لیا، مگر پھر اسے اچانک اپنے دوستوں کا خیال آیا تو اس نے ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اس سنسان جنگل میں راستہ بھٹک گیا ہے۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ کہیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کیسے ڈھونڈے اور اس ویران جنگل سے باہر نکلنے کے لیے کیا کرے۔ رفتہ رفتہ سورج بھی غروب ہونے لگا تو نعمان اور زیادہ فکر مند ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اندھیرا چھا گیا تو جنگل سے باہر نکلنا اور اپنی راہ تلاش کرنا اس کے لیے مزید مشکل ہو جائے گا۔ اتنے میں اسے اپنی امی کی نصیحت یاد آ گئی۔ انہوں نے ایک مرتبہ نعمان سے کہا تھا: ”بیٹا! اگر کبھی تم کسی جگہ پھنس کر راستہ بھول جاؤ تو نہ پریشان ہونا اور نہ ہی ہمت ہارنا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہی انسان کو مشکل میں ڈال کر اس کو آزماتا ہے اور پھر وہی اسے اس مشکل سے نکالتا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پریشانی میں اللہ سے مدد مانگی جائے۔“

نعمان نے وقت ضائع کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس سے مدد مانگی۔ اس کے بعد وہ بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل پڑا۔ پھر تو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ بتا دیا ہو۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ جنگل سے باہر نکل آیا جہاں اسے اپنے دوست بھی مل گئے جنہیں دیکھ کر نعمان کو بے حد خوشی ہوئی۔ گھر جا کر اس نے جب اپنی امی کو یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے اسے گلے لگا کر کہا: ”خدا کا شکر ہے کہ میرے بیٹے کو صحیح وقت پر میری نصیحت یاد آ گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری نصیحت کو یاد رکھا اور اس پر عمل کیا۔ یاد رکھو جو بچے اپنے ماں باپ کی ہدایات اور نصیحتوں کو یاد رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد کرتا ہے۔“ n

جعلی نوٹ کیسے پکڑا گیا

مریم فاطمہ

شام کا وقت تھا۔ سبزی مارکیٹ گاہکوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس مارکیٹ کے ایک کونے پر شامی کا ٹی اسٹال تھا اور دوسرے کونے پر ایک پولیس چوکی بنی ہوئی تھی۔ شامی سمجھ دار اور محنتی نوجوان تھا۔ وہ اپنے اسٹال پر کام میں مصروف تھا کہ اس کی دکان کے سامنے ایک بائیک آکر رکی جس پر سے دو نوجوان اتر کر اندر داخل ہوئے اور شامی سے چائے بنانے کو کہا۔ شامی نے چائے تیار کر کے ان کے سامنے رکھی تو ایک نوجوان نے اپنی جیب میں سے سو کا بالکل نیا اور کرارا نوٹ نکال کر شامی سے کہا: "جب تک ہم چائے پیتے ہیں، تم اس میں سے چائے کے 30 روپے کاٹ لو اور باقی 70 مجھے دے دو۔"

"مگر صاحب! میرے پاس 100 کا کھلا نہیں ہے۔" شامی نے کہا۔

نوجوان چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا: "کوئی بات نہیں، تم ابھی یہ 100 کا نوٹ رکھ لو، کل میں جب یہاں سے گزروں گا تو باقی کے 70 روپے لے لوں گا۔"

اس کی بات سن کر شامی الجھن میں پڑ گیا، پھر اس نے کہا: "اچھا، میں کوشش کرتا ہوں کہ کھلا مل جائے۔" یہ کہہ کر شامی برابر والی دکان پر گیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ مجھے بالکل نیا کرارا نوٹ کیوں دے رہے ہیں، جب کہ ان کی جیب میں پانچ اور دس روپے والے کئی مڑے تڑے نوٹ موجود تھے۔ اسے وہ دونوں کچھ پراسرار سے لگے۔ شامی نے کئی دکانوں پر معلوم کیا، مگر اتفاق سے کسی نے بھی اسے کھلا نہیں دیا۔ اچانک شامی کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھی دکان دار وہ نیا نوٹ لیتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں۔ کیوں؟ کہیں یہ نوٹ جعلی تو نہیں؟ بس یہ خیال آتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا، اس وقت تک وہ مارکیٹ کے دوسرے سرے پر واقع پولیس چوکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ سیدھا چوکی کے اندر گیا اور وہاں موجود اہل کاروں کو اپنے پراسرار گاہکوں اور سو کے نئے نوٹ کے بارے میں بتا دیا

۔

ایک پولیس والے نے شامی سے وہ نوٹ لے کر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "تمہارا خیال ہے کہ یہ نوٹ جعلی ہے؟"

"جی مجھے یہی شبہہ ہے۔" شامی نے جلدی سے جواب دیا۔

"تمہارا خیال ٹھیک لگ رہا ہے۔" پولیس والے نے کہا۔ پھر اس نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا: "تم اس چائے والے کے ساتھ اس کے اسٹال پر جاؤ اور دیکھو کہ معاملہ کیا ہے۔"

چناں چہ شامی دو پولیس والوں کے ساتھ جب اپنے اسٹال پر پہنچا تو اس کے دونوں مشکوک گاہک اسے دیکھ کر چونکے۔

"جناب! میں آپ کے اس نوٹ کا کھلا نہیں کرا سکا۔" شامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی ایک نوجوان نے اس نوٹ کو شامی کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر چھینا اور اپنے بیگ میں رکھنے والا ہی تھا کہ پولیس والوں نے اسے دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ دونوں نوجوان بری طرح بوکھلا گئے۔ چند لمحوں بعد پولیس انسپکٹر بھی وہاں آگیا اور ان دونوں کی کلاس شروع ہوئی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کے پاس پانچ لاکھ روپے کی جعلی کرنسی ہے جس میں سے دس ہزار وہ مارکیٹ میں پھیلا چکے ہیں اور باقی پر کام ہو رہا ہے۔

کچھ ہی دیر میں شامی کی ہوشیاری کی یہ خبر پوری سبزی مارکیٹ اور پھر پورے شہر میں پھیل گئی۔ پولیس نے جعلی کرنسی بنانے والے اس گروہ کو گرفتار کر لیا اور شامی کو اس بہادری پر انعام دیا گیا۔ n

جب ہنس نے ہالینڈ کو بچایا

محمد عماد بیگ۔ کراچی

ہالینڈ کو نیدر لینڈ بھی کہتے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو "ڈچ" یا "ولندیزی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ایک روز ہالینڈ میں رہنے والا ہینس برنکر نامی ایک لڑکا اپنے ایک دوست مسٹر جینسن سے ملنے گیا۔ جو بڑی عمر کے تھے اور نابینا بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کافی دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ آخر ہینس نے سنزان سے اجازت لی اور اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ جس راستے سے جا رہا تھا، وہ بہت خوب صورت اور سر سبز تھا۔ کافی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا، پھر اسے احساس ہوا کہ دیر ہو گئی ہے، چناں چہ وہ جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ہالینڈ وہ ملک ہے جہاں سمندر کی سطح زمین سے بلند ہے، مگر ان لوگوں نے سمندر کے پانی کو خشکی پر آنے سے روکنے کے لیے اس کے کنارے پر مضبوط پشتے بنا رکھے ہیں اور دن رات بلند دیواروں جیسے ان پشتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس وقت ہینس انہی پشتوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہالینڈ کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اگر ان پشتوں میں سے کسی ایک میں بھی کوئی سوراخ ہو گیا تو پشتہ ٹوٹ جائے گا اور سمندر کا پانی ان کی زمین پر چڑھ دوڑے گا۔ پشتے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے پانی ٹپک رہا ہو۔ ہینس نے غور کیا تو اسے پشتے میں ایک چھوٹا سا سوراخ دکھائی دیا۔ اب تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس سوراخ کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو یہ بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ اس سے آگے ہینس کچھ نہ سوچ سکا۔ اس نے جلدی سے اپنی انگلی پشتے کے سوراخ میں پھنسا دی اور مدد کے لیے چلانے لگا۔ مگر اس وقت اس کی مدد کو کون آتا، ویسے بھی اب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ساری رات ہینس اپنی انگلی اس پشتے کے سوراخ میں پھنسائے اپنے ملک کو سمندر میں غرق ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ سردی بھی بڑھ چکی تھی جس کی وجہ سے ہینس کا پورا جسم ہی ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا، مگر اپنی سرزمین کو بچانے کا احساس اسے وہاں سے نہ ہٹا سکا۔

آخر کار صبح ہوئی تو ایک پادری وہاں سے گزرا، اس نے ہینس کی آوازیں سنیں تو فوری طور پر بہت سے لوگوں کو مدد کے لیے طلب کر لیا جنھوں نے ہینس کو اس کے گھر پہنچایا اور اس پشتے کی مرمت بھی کی۔ سبھی لوگوں نے ہینس کی بہادری اور اس کی ہمت کی بہت تعریف کی۔ واقعی اس نے اپنی ہمت سے ہالینڈ کو بچا لیا تھا۔ n

جنگل کہانی

صبور مشتاق حسن۔ کراچی

ایک ہرے بھرے جنگل میں ایک خانہ بدوش خاندان رہنے کے لیے آیا۔ خانہ بدوشوں کی فطرت میں ایک جگہ رہنا نہیں، لیکن چوں کہ اس خاندان کا سربراہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اسی جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں تو خانہ بدوشوں نے اپنے رہنے کے لیے خیمے لگا لیے، لیکن جنگل کی تیز ہواؤں اور بڑے جانوروں کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لیے انہیں ایک بڑے اور مضبوط گھر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانہ بدوش کے چار بیٹوں کی رائے تھی کہ جنگل سے باہر رہتے ہیں جہاں بڑے ٹیلوں کے نیچے بڑے بڑے کمروں جیسی کھلی جگہیں ہیں۔ لیکن اس خاندان کا بوڑھا سربراہ نہ مانا، مجبور ہو کر بیٹوں نے باپ کی بات مان لی اور جنگل میں ہی مضبوط ٹھکانے کا بندوبست کرنا شروع کیا۔ ان کی نظر سب سے پہلے نیم، پیپل، شہتوت، شیشم اور کھجور کے درختوں پر پڑی۔ کچھ ہی عرصے میں ان باپ بیٹوں نے مل کر جنگل میں گھنے درختوں کے درمیان ایک بڑی اور مضبوط ہٹ بنالی۔ پھر وہاں گائے، بھینس، بکری، بھیڑیں، مرغیاں اور بطخیں وغیرہ پالنی شروع کر دیں۔

اب انہیں اپنے گھر میں ہی گوشت، دودھ، انڈے، پھل اور سبزیاں وغیرہ وافر مقدار میں ملنے لگیں اور ان کی زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔ لیکن جہاں انہوں نے اپنا گھر بنایا تھا، وہاں سے بڑے اور گھنے درختوں کا اور ان درختوں پر بسنے والے پرندوں کا مکمل صفایا ہو گیا۔ اس طرح جنگل کی دنیا کا ایک خوب صورت حصہ ختم ہو گیا۔

ان خانہ بدوشوں کو عیش و آرام سے رہتا دیکھ کر ان کے قبیلے کے دوسرے لوگوں کو بھی اسی طرح ایک ہی جگہ رہنے کی خواہش ہوئی اور انہوں نے بھی جنگل کے ایک بڑے سے حصے سے درختوں کا صفایا کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا بنالیا۔

پہلے والے خانہ بدوشوں کو اعتراض تو ہوا، لیکن وہ انہیں روک نہ سکے، کیوں کہ جنگل ان کی ذاتی جاگیر تو نہ تھا۔ پھر دوسرے خانہ بدوش خاندان کے لوگ بھی زیادہ تھے جن میں چار بھائی اور پانچ بیٹے تھے۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں خانہ بدوش جنگل میں آ کر آباد ہو گئے اور وہ خانہ بدوشوں کا شہر بن گیا۔ لیکن اصل جنگل اب ختم ہو گیا تھا جس کے ساتھ ہی گھنے درخت اور ان پر لگنے والے پھل بھی ختم ہو گئے اور قیمتی جڑی بوٹیاں بھی۔ ان درختوں میں بسیرا کرنے والے قیمتی پرندے بھی بے گھر ہو گئے۔

شروع میں خانہ بدوش جنگل سے ملنے والی نعمتوں کی وجہ سے خوش حال تھے، لیکن جب یہ نعمتیں نہ رہیں تو وہ بھی بدحال ہو گئے۔ لیکن جنگل میں ٹھاٹ باٹ سے رہنے کی وجہ سے وہ اتنے بے پروا ہو گئے تھے کہ اب کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ جنگل سے شہر اور گاؤں جانے والا راستہ کافی دور تھا۔ آنے جانے کے کوئی ذرائع نہیں تھے اور پیدل آنا جانا ممکن نہیں تھا۔

اب جنگل میں آباد خانہ بدوشوں کے ان دونوں خاندانوں کے درمیان روز روز لڑائی جھگڑا ہونے لگا جس کے بعد پریشان ہو کر کچھ لوگوں نے وہاں سے جانا شروع کر دیا اور کچھ عرصے میں ہی وہ جگہ جو کبھی ایک ہرا بھرا جنگل تھی، اب ایک اجاڑ اور ویران بستی کی طرح بھائیں بھائیں کرنے لگی۔ اس کا ذمے دار بھی خود انسان ہی تھا، کیوں کہ قدرت نے تو اس پر اپنی فیاضی اور مہربانی کی انتہا کر دی تھی اور ہر نعمت سے نواز دیا تھا، مگر انسان نے ان نعمتوں کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی جو فطرت سے بغاوت ہی تو تھی جس کی سزا دوسرے انسانوں کو بھی ملی۔ نہ جانے انسان کی سمجھ میں یہ کب آئے گا کہ جنگل بھی انسان کے لیے قدرت کا انمول تحفہ ہے اور جنگل کو ختم کرنا، بلکہ ایک درخت کو بھی کاٹنا، ساری انسانیت کو تباہ کرنا ہے۔ n

جھوٹ نہ بولنا

ثروت یعقوب ...... لاہور

احمد اور حنیف دونوں آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے۔ احمد کو اس اسکول میں آئے ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ حنیف نے احمد سے دوستی کر لی۔ احمد کلاس میں سال کے آخر میں آیا تھا کہ اس کے ابو کا تبادلہ اچانک ہی ہو گیا تھا۔ احمد کو کلاس کا پچھلا تمام کام مکمل کرنا تھا۔ اس لئے وہ سارا دن کلاس میں بیٹھا اپنا کام مکمل کرتا رہتا۔ حنیف کبھی کبھار اس کی مدد کر دیتا۔ چند دوستوں کے علاوہ احمد کلاس کے دیگر طالب علموں کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ کام میں مگن رہنے کی وجہ سے وہ حنیف کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد احمد اور حنیف کی آٹھویں کلاس کے امتحان تھے۔ احمد پرچوں کی تیاریوں میں بہت مگن رہتا تھا جبکہ حنیف کا زیادہ دھیان نقل مارنے اور جھوٹ بولنے کی طرف ہوتا تھا۔ پیپرز کے بعد جب رزلٹ آیا تو حنیف چار مضامین میں فیل تھا۔ حنیف نے جب اپنا رزلٹ دیکھا تو اسے اپنے والدین کی ڈانٹ ڈپٹ کا خیال آیا کہ اس کے والدین پاس نہ ہونے کی صورت میں اسے کیا سزا دیں گے، اس ڈر سے اس نے وہ رزلٹ اپنے والدین کو دکھانے کی بجائے اور ان کے دستخط کروانے کی بجائے خود ان پر اپنے والدین کے دستخط کر دیے اور اگلے دن رزلٹ کارڈ واپس مس کو دے دیے جو کہ والدین کے دستخط کروانے کے بعد واپس کرنا تھا۔ مس نے جب وہ سائن فرسٹ ٹرم رزلٹ کارڈ پہ کیے گئے دستخط کے ساتھ ملائے تو وہ جعلی نکلے۔ مس نے حنیف کو بلایا اور اس سے ان جعلی دستخط کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس نے کیے ہیں؟ حنیف کے جھوٹ بولنے پر مس صاحبہ حنیف کو پرنسپل کے پاس لے گئیں، جب پرنسپل نے بھی یہی سوال کیا تو حنیف نے پھر وہی جھوٹ بولا۔ لیکن جب اسے اپنے والدین کو لانے کے لئے کہا گیا تو اس نے پھر جھوٹ بولا کہ یہ دستخط اس کے دوست احمد نے اس کے رزلٹ کارڈ پر کیے ہیں۔ جب احمد کو بلا کر پوچھا گیا تو احمد نے کہا میں تو نہیں جانتا میں نے تو اس کا نتیجہ بھی نہیں دیکھا، مس کو بھی احمد پر شک ہوا۔ کیونکہ وہ کلاس میں نیا طالب علم تھا۔ پرنسپل صاحب نے احمد پر کافی زور زبردستی کی وہ سچ بتا دے۔ جبکہ وہ سچ ہی بتا رہا تھا۔ اگلے دن دونوں کے والدین کو اسکول بلا لیا گیا۔ جب حنیف کے والدین سے دستخط کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اس طرح حنیف کا جھوٹ پکڑا گیا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اب اس کا جھوٹ نہیں چل سکتا، تو اس نے اقرار کیا کہ یہ دستخط اس نے اپنے والدین کے خوف سے خود کیے ہیں۔

پیارے بچو! حنیف کو اپنا ایک جھوٹ چھپانے کے لئے بہت سے جھوٹ بولنے پڑے اور اس کی سزا اسے یہ ملی کہ نہ صرف اسے اسکول سے نکال دیا گیا بلکہ اسے ایک کلاس پیچھے داخلہ ملا، اس ایک جھوٹ سے صرف اس نے اپنی زندگی ہی خراب نہیں کی بلکہ اپنے دوست کو بھی دکھ پہنچایا۔ اس لئے پیارے بچو! ہمیشہ سچ بولو۔ کیونکہ اسلام ہمیں سچ بولنے کا درس دیتا ہے اور اسی میں راحت اور آسانی ہے۔





کامیابی کا راز

صاحب زادی عائشہ رحمٰن۔ رسال پور

علی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ آج اسکول سے گھر آتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔وہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔اس کی امی اسے دوپہر کے کھانے کے لیے بلانے آئیں تو وہ سو چکا تھا۔بات دراصل یہ تھی کہ آج اس کا رزلٹ آیا تھا اور وہ فیل ہوگیا تھا۔شام کو جب علی کے ابو آفس سے آئے تو انھوں نے علی سے اس کے رزلٹ کے بارے میں پوچھا۔اس موقع پر علی نے بہ مشکل اپنی رپورٹ کارڈ ابو کو دکھائی۔وہ اس کی ناکامی پر بہت مایوس ہوئے۔وہ جانتے تھے کہ ان کا بیٹا ایک لائق طالب علم ہے، لیکن نہ جانے کیوں اس کا رزلٹ ان کی توقع کے برعکس نکلا۔انھوں نے علی سے ناراض ہونے کے بجائے اس سے فیل ہونے کی وجہ دریافت کی،کیوں کہ وہ اپنے کمرے میں پڑھتا تھا۔

علی نے ابو کو بتایا کہ میں نے سارا سال پڑھنے کے بجائے کمپیوٹر پر گیمز کھیلے اور کارٹون دیکھے تھے۔میں سوچتا تھا کہ کل پڑھ لوں گا اور جب امتحانات قریب آگئے تو میں تیاری نہیں کر سکا۔پھر اس نے ابو سے اپنی ناکامی کی معافی مانگی اور کہا:"ابو! مجھے ایک موقع اور دیجیے۔میں سارا سال محنت سے پڑھوں گا اور کمپیوٹر پر گیمز بھی نہیں کھیلوں گا۔میں آپ سے اور امی سے بہت شرمندہ ہوں۔"

علی کے ابو نے اسے معاف کرتے ہوئے کہا:"میں تمھیں ایک موقع اور دیتا ہوں، مگر اب میں تمہاری ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔"

اب علی نے سال کے شروع ہی سے سخت محنت شروع کردی اور کمپیوٹر گیمز کھیلنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی کو دینا شروع کردیا۔امتحانات قریب آرہے تھے اور علی کی تیاری تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔جب امتحانات ہوئے تو اس کے تمام پیپرز بہت اچھے ہوئے اور اسے کوئی مشکل بھی پیش نہیں آئی۔پھر وہ دن بھی آگیا جب امتحان کا رزلٹ آنا تھا۔جب رزلٹ آیا تو علی اپنی کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔اس کی محنت رنگ لائی تھی۔اس کی امی اور ابو بھی رزلٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: "اگرچہ تم نے ایک قیمتی سال ضائع کیا، لیکن تم نے کامیابی کا راز پالیا۔"

علی نے ابو سے کہا:"ابو! مسلسل محنت، وقت کی قدر یہی وہ راز ہیں جنھوں نے مجھے کامیابی دلائی اور انشاءاللہ اب میں ان اصولوں سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"n

خطرناک کنواں

فاروق جان۔ سوات

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم سوات کے ایک گاؤں ''ڈڈہرہ'' میں رہتے تھے۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی اور میرا چھوٹا بھائی فرمان لگ بھگ چار سال کا تھا۔ ہم ہر روز شام کو آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ گاؤں کے دوسرے بچے بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی فرمان اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اس کی ضد پر امی ہمیشہ اسے میرے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج دیا کرتی تھیں۔

میری کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کھیل میں کبھی چور نہ بننا پڑے، اس لیے میں ہر بار کسی ایسی جگہ چھپنے کی کوشش کرتا جہاں کسی بھی بچے کی نظر مجھ پر نہ پڑے، لیکن فرمان ہمیشہ میرے ساتھ ہی چھپ جاتا اور عین موقع پر اسے کھانسی یا چھینک آجاتی جس کے باعث میں ہر بار پکڑا جاتا۔

وہ جون کی ایک تپتی دوپہر تھی ہم سب بچوں نے اس بار ''کنویں والے حصے'' کی طرف کھیلنے کا پلان بنایا۔ یہاں گاؤں کا سب سے بڑا کنواں واقع تھا۔ کنویں والے حصے کے فوراً بعد درختوں کا ایک گہرا جھنڈ تھا۔ گاؤں کے سبھی بچوں کو اس کنویں کی وجہ سے یہاں کھیلنے سے منع کیا گیا تھا کہ کہیں کوئی بچہ اس کنویں میں گر نہ جائے۔ کنویں کی زمین کا یہ ٹکڑا نہ جانے کب سے بے کار اور بنجر پڑا تھا۔ اس پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ گاؤں کے بہت سے لوگوں نے اسے زرخیز کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی، اس پر ہل بھی چلایا اور فصل اگانے کی کوشش بھی کی، مگر اس زمین پر کوئی اثر نہ ہوا۔

بس اس دن ہم سب دوستوں نے یہیں پر کھیلنے کا پلان بنایا تھا۔ ہمارا ایک دوست رفیق چور بنا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی فرمان بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ تم سامنے والے ٹیلے کے پیچھے چھپ جاؤ اور میں اس کنویں میں چھپ جاتا ہوں۔ فرمان نے پہلے تو ہمارے ساتھ چھپنے کی ضد کی لیکن بعد میں وہ مان گیا۔ میں اس سے جدا ہو کر دور واقع درختوں کے جھنڈ میں چھپ گیا۔

کافی دیر تک مجھے کسی کی آواز سنائی نہ دی تو میں حیرت سے اپنی جگہ سے باہر نکلا۔ یکایک دور سے میں نے اپنے چھوٹا بھائی فرمان کو دیکھا جو اس خطرناک کنویں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے اسے چیخ کر رکنے کو کہا اور فوراً اس کی طرف دوڑ لگا دی، لیکن وہ میری آواز نہ سن سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ وہ بے چارہ مجھے تلاش کرنے کے چکر میں اس خطرناک کنویں میں کود چکا تھا۔ اب میں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

اتفاق کی بات کہ ہمارے چچا نعمان شہر سے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے جب گاؤں کے بچوں کو کنویں کے قریب کھیلتے دیکھا تو ڈانٹ کر ان سب کو بھگا دیا۔ پھر انہوں نے فرمان سے میرے بارے میں پوچھا تو اس بے چارے نے کہا: ''مجھے پتا ہے بھائی کہاں چھپا ہے، میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔''

چچا اس کی اور میری واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ یکایک انھوں نے شڑاپ کی آواز سنی اور ہماری چیخ بھی، بس وہ سمجھ گئے کہ کیا ہوا ہے۔ وہ فوراً کنویں کی طرف بھاگے۔ میں بھی خوف زدہ ہو کر کنویں کے کنارے کھڑے ہو کر رونے لگا۔ چچا نے کنویں میں کود کر بڑی مشکل سے فرمان کو پکڑا۔ ہمارا شور سن کر گاؤں کے کچھ لوگ بھی آ گئے۔ انھوں نے کنویں میں رسی لٹکائی اور چچا فرمان کو پکڑے ہوئے پانی میں شرابور کنویں سے باہر نکل آئے۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ وہ کنواں زیادہ گہرا نہ تھا، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ آج بھی مجھے جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔n

خود غرض کوا

ادیب سمیع چمن۔ حیدر آباد

ایک ہرا بھرا اور شاداب باغ تھا جس میں طرح طرح کے درخت تھے جن میں پیپل، نیم، برگد وغیرہ شامل تھے۔ کچھ سال پہلے تک یہ درخت ہماری شاہ راہوں کی جان تھے، مگر اب کم کم دکھائی دیتے ہیں۔ان درختوں میں مختلف پرندوں جیسے مینا، بلبل، فاختہ اور کوئل کے گھونسلے ہوتے تھے جن کی مدھر آوازیں ہر طرف گونجتی تھیں۔ ایسے ہی ایک نیم کے درخت پر مینا کا گھونسلا تھا جس کے برابر میں پیپل کا درخت تھا جس پر ایک چالاک اور خود غرض کوا رہتا تھا۔ مینا اور کوے میں دوستی تھی۔ مینا جب بھی کوئی اچھی چیز پکاتی تو بھائی کوے کو ضرور دیتی تھی اور کوا اس کا شکریہ ادا کیے بغیر ہڑپ کر جاتا تھا۔ کوا اکثر مینا سے کوئی نہ کوئی چیز مانگ کر لے جاتا تھا اور مینا خوشی خوشی دے دیتی تھی۔ مگر کوا اتنا خود غرض تھا کہ مینا کو کبھی کچھ نہیں دیتا تھا۔وہ مینا سے صرف اپنے مطلب سے ملتا تھا۔ مینا سیدھی تھی، اس نے کبھی کوے کی چالاکی پر غور بھی نہیں کیا تھا۔

ایک دن صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پرندے خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ مینا نے کھیر پکائی تو سب جانوروں کی دعوت کی۔ کوے میاں کو بھی پیالہ بھر کر کھیر دی جو وہ فوراً چٹ کر گیا بلکہ اور مانگنے آ گیا۔ مینا نے اسے مزید کھیر دی جب کہ اس نے یہ کھیر اپنے بچوں کے لیے رکھی تھی۔ دوسرے روز رات کو مینا کے ہاں کچھ مہمان آ گئے۔ مینا نے ان کے لیے کھانا پکانا شروع کیا تو یاد آیا کہ نمک نہیں ہے، وہ کوے کے پاس نمک لینے گئی تو اس نے بے پروائی سے کہہ دیا: "میں سو رہا ہوں۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جاؤ چلی جاؤ، صبح بات کرنا۔"

مینا کو کوے کی اس بے رخی پر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے تو آج تک کوے کو کبھی کوئی چیز دینے سے منع نہیں کیا تھا۔ مینا کا دل ٹوٹ گیا۔ اسے دوستی کے نام سے نفرت ہو گئی۔ وہ آنسو بہاتی گھر واپس آ گئی اور بغیر نمک کا کھانا پکا کر مہمانوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے فریاد کر رہی تھی کہ مطلبی کوے کو اس خود غرضی کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اسی رات بادل چھا گئے اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے جس کے ساتھ ہی ایسی زبردست بارش ہوئی کہ ندی اور پرنالے بہنے لگے۔ کوا بڑے مزے سے اپنے گھونسلے میں سو رہا تھا کہ اچانک ہونے والی بارش نے اس کا گھونسلا تباہ کر دیا۔ اس کا سارا سامان بھی بہہ گیا تھا اور وہ خود بھی بارش میں بھیگ کر ٹھٹھر رہا تھا۔ آخر اسے مینا کے گھر کا خیال آیا تو سوچا کہ مینا کے گھر چلتا ہوں جو شاید بارش سے محفوظ ہو گا، وہاں رات آرام سے گزر جائے گی۔

چناں چہ گرتا پڑتا مینا کے گھر پہنچا۔ مینا جاگ رہی تھی، اس نے پوچھا: "کون ہے؟"

"میں ہوں بی مینا، کوا، تمہارا بھائی!" لرزتی ہوئی آواز میں کوا بولا۔

کوئی اور ہوتا تو دھکے دے کر بھگا دیتا، مگر مینا بہت نیک دل تھی، وہ جانتی تھی کہ کوے نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا تھا، پھر بھی اس نے دروازہ کھول دیا اور بھیگا ہوا کوا اندر چلا گیا۔ مینا نے کوے کو اوڑھنے کے لیے گرم چادر دی اور اس کے لیے بستر بھی بچھا دیا۔

مینا کہہ رہی تھی: "کوے بھائی! معاف کرنا میرے چھوٹے سے گھونسلے میں آپ کو آرام تو نہیں ملے گا، مگر اس وقت یہی حاضر ہے۔"

"فکر نہ کریں مینا بہن، آپ جائیں میں سو جاؤں گا۔" کوے نے کہا۔

مینا چلی گئی تو کوا تیزی سے اٹھا اور اس جگہ کی تلاشی لینے لگا جہاں اسے کشمش اور بادام کا ڈبا ملا۔ یہ ڈبا مینا نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے تیار کیا تھا۔ مگر کوے نے وہ ڈبا اٹھایا اور رات بھر میں ساری کشمش اور بادام کھا گیا۔ وہ اپنا کام تو کر چکا تھا، اب اسے وہاں سے بھاگنا تھا۔ بارش بھی رک چکی تھی۔ چناں چہ صبح کی پو پھٹتے ہی وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ صبح دیر تک کوے کی آواز نہ آئی تو مینا اسے جگانے اندر گئی تب اسے پتا چلا کہ کوا اپنی فطرت سے باز نہیں آیا۔ وہ نہ صرف بھاگ چکا تھا، بلکہ بستر پر پڑا کشمش اور بادام کا خالی ڈبا بھی اس کی خود غرضی اور بے وفائی کی کہانی سنا رہا تھا۔ مینا کو کوے کی اس حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا، مگر پھر اس کے دل نے کہا کہ انسان ہو یا جانور، اس کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ n

کنزہ کی توبہ

نرگس عامر۔ کورنگی

کنزہ معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ اس پر اس کا رنگ بھی خاصا کالا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ سبھی اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسکول میں بھی وہ سب کے مذاق کا نشانہ بنتی تھی۔ خوب صورت اور گوری لڑکیاں اسے کلو یا کالی مینا کہتی تھیں۔ اکثر لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتیں اور اس سے پوچھتیں: ”تم کون سی کریم استعمال کرتی ہو؟ تمہارے اس حسن کا راز کیا ہے؟“ کنزہ کو یہ سب برا تو لگتا تھا مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟

وہ گھر لوٹتی تو حقارت سے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رہتی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ گوری کیوں نہیں ہے۔

ایک روز کنزہ خالہ کے گھر گئی اور اپنی کزن شبانہ سے باتیں کرنے لگی۔ شبانہ نے اس سے کہا: ”تم اپنا خیال رکھا کرو، تمہارا رنگ تو پہلے سے بھی زیادہ کالا ہو رہا ہے اور جلد بھی خراب ہو رہی ہے۔ فیس واش سے منہ دھوؤ اور کوئی اچھی کریم یا لوشن لگایا کرو۔“ یہ سن کر کنزہ افسردگی سے بولی: ”یہ چیزیں تو کافی مہنگی آتی ہوں گی۔ ہمارے گھر میں صرف سردی میں کولڈ کریم آتی ہے۔“ شبانہ نے کہا: ”اپنا خیال رکھنے کے لیے تھوڑے بہت پیسے تو خرچ کرنے ہوں گے۔ میں تمھیں کچھ کریموں کے نام لکھ کر دیتی ہوں، ان سے تمہارا رنگ گورا ہو جائے گا۔“

کنزہ نے شبانہ کا لکھا ہوا پرچہ سنبھال کے رکھ لیا، مگر اب پیسوں کا مسئلہ تھا۔ کنزہ کی امی سلائی کر کے گھر چلاتی تھیں ۔

ایک دن اس نے ہمت کر کے ان سے کہا: ”امی! میری سب کاپیاں بھر گئیں۔ نئی کاپیاں لانی ہیں۔“

امی حیران ہو کر بولیں: ”ساری کاپیاں ایک ساتھ کیسے بھر گئیں؟“ کنزہ نے جلدی سے کہا: ”مجھے نئے جوتے بھی چاہئیں۔“ پھر اس نے اسی طرح الٹی سیدھی باتیں کیں، مگر امی نے کہا ”میرے پاس پیسے تو ہیں، مگر ان سے سودا سلف لانا ہے۔ راشن ختم ہو گیا۔ تمھیں بعد میں پیسے دے دوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔

کنزہ سوچنے لگی کہ امی کو مجھ سے پیار نہیں ہے، انھوں نے کبھی میرا خیال نہیں رکھا، اسی لیے تو میں اتنی کالی ہوں۔

کنزہ کو پتا تھا کہ اس کی امی مشین کی دراز میں پیسے رکھتی ہیں۔ اس نے اس میں سے پیسے نکال لیے اور اندر جا کر ایسے لیٹ گئی جیسے سو رہی ہو۔ اس کی امی آئیں اور پیسے نکالنے کے لیے سلائی مشین کی دراز کھولی تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے کنزہ سے پوچھا تو وہ ناراض ہو کر بولی: ”امی! کیا میں چور ہوں؟“

امی جلدی سے بولیں: ”تم مجھ سے مانگ رہی تھیں ناں، اس لیے میں سمجھی کہ تم نے لیے ہیں، لیکن آخر پیسے گئے کہاں؟“

کنزہ بولی: ”امی! ہو سکتا ہے کہ آپ نے بیسی کے پیسے ادا کر دیے ہوں یا کہیں اور تو خرچ نہیں کر دیے؟“

امی نے کہا: ”میری یادداشت کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ آج کل کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔“

اس کے بعد وہ محلے سے سلائی کے جو پیسے لائی تھیں، ان سے آٹا اور کچھ تھوڑا سا سامان خرید لائیں اور کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگیں۔

کنزہ اپنی سہیلی کے گھر کا بہانہ کر کے ایک دکان پر گئی اور دکان دار کو پرچہ اور پیسے دے دیے۔ دکان دار بہت چالاک تھا۔ اس نے کنزہ کو جعلی کریمیں اور پرانا فیس واش دے دیا جسے لے کر کنزہ خوشی خوشی واپس آئی اور کمرے میں چلی گئی۔ اس رات سب گھر والوں نے چٹنی سے روٹی کھائی۔ کنزہ کے ابو بھی غصہ ہو رہے تھے کہ پیسے آخر گئے کہاں؟ لیکن کنزہ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے وہ کریمیں مکس کر کے رات کو تھوڑی سی لگائی اور سو گئی۔ اب وہ روزانہ رات کو کریم لگا کے سوتی اور فیس واش سے منہ دھوتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اب کچھ ہی دن میں میرا رنگ گورا ہو جائے گا۔ پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن کنزہ کے چہرے اور گردن پر چھوٹے چھوٹے دانے نکلے تو وہ پریشان ہو گئی۔ گھر والے سمجھے کہ گرمی کی وجہ سے نکلے ہیں، لیکن دو دن بعد دانے بڑے ہو گئے اور چہرہ سوج گیا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو رونے لگی۔ کنزہ کا چھوٹا بھائی اس کا مذاق اڑانے لگا۔ اس کی امی بھی پریشان تھیں۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جس نے بتایا کہ کسی خراب کریم کی وجہ سے الرجی ہو گئی ہے۔ جب کنزہ نے امی کو پریشان دیکھا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتا دی۔ امی یہ سن کر پریشان ہو گئیں کہ اس نے اپنے چہرے پر جعلی کریم لگائی ہے اور یہ کہ وہ گوری ہونا چاہتی ہے۔ انہوں نے کنزہ کو سمجھایا: ”جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ اب دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ کالا ہونا کوئی عیب تو نہیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی کالا اور کوئی گورا، کوئی موٹا تو کوئی دبلا، کوئی خوب صورت تو کوئی بدصورت، سب برابر نہیں ہوتے۔ انسان کا اچھا اخلاق ایسی چیز ہے جسے سب ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ انسان کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“

امی کی باتیں سننے کے بعد کنزہ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس نے خدا کی ناشکری کی جس کی اسے سزا ملی ہے۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی اپنے کالے رنگ کی وجہ سے پریشان نہیں ہو گی اور ساری توجہ اپنے اعمال پر دے گی، تاکہ لوگ اس کی عزت کریں۔n

کتاب کیسے گم ہوئی؟

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

آج مس نے جماعت میں جب سب بچوں کو سائنس کی کتاب کھولنے کو کہا تو ارشاد پریشان ہو گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا: ''مس! میری کتاب گم ہو گئی ہے۔''

یہ آج تیسرا موقع تھا کہ ارشاد کی کتاب گم ہو گئی تھی۔ اس نے گھر آ کر امی کو بتایا تو امی نے پہلے تو اسے خوب ڈانٹا، اس کے بعد مجبوری میں اسے نئی کتاب خرید کر دی۔

ارشاد اپنے بڑے بھائی ساجد سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اسکول سے آتے ہی اپنا بستہ ایک طرف پھینکتا اور جوتے اتار کر دوسری طرف اچھال دیتا، جب کہ اس کا بڑا بھائی ساجد اپنی تمام کتابیں بھی ترتیب سے الماری میں رکھتا تھا اور اپنے جوتے اتار کر جوتوں کے ریک میں رکھ کر سلیپر پہن لیتا تھا۔

شام کو دونوں بھائی فٹ بال کھیلنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر ہوم ورک کرنے بیٹھے تو ساجد نے اپنے اسکول بیگ سے باری باری تمام کتابیں اور کاپیاں نکالیں۔ اس نے اسکول کا کام کیا اور پھر ترتیب سے تمام کتابیں اور کاپیاں واپس بستے میں رکھ دیں۔ لیکن دوسری جانب ارشاد کا اسکول بیگ اوندھا پڑا تھا۔ قلم کہیں اور کتاب کہیں اور پھر اسکول کا کام مکمل کرنے کے بعد انہیں اسی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بس صبح اسکول جانے سے پہلے جلدی جلدی تمام کتابیں اور قلم سمیٹ کر بستے میں ٹھونس دیں۔

ساجد ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کو سمجھاتا کہ اپنی تمام چیزیں ترتیب اور سلیقے سے رکھا کرو، تاکہ ڈھونڈنے میں مشکل نہ ہو مگر ارشاد ہمیشہ ساجد کی نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا۔

رات کو ساجد اپنا سبق یاد کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا ارشاد بستر پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائے کتاب پڑھ رہا ہے اور پھر کتاب چہرے پر رکھے رکھے ہی سو گیا۔

صبح اس نے اسکول جانے سے پہلے اپنے بستے میں تمام کتابیں ٹھونسنا شروع کیں تو ایک کتاب پھر گم تھی۔ اس نے پریشان ہو کر ساجد سے پوچھا: ''ساجد بھائی! میری کتاب کہیں گم ہو گئی۔ آپ نے تو نہیں دیکھی؟''

ساجد نے کہا: ''رات کو تم کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے، وہیں کہیں گر گئی ہو گی۔''

جب دونوں نے مل کر بستر ہٹایا تو وہاں ارشاد کی تین عدد گم شدہ کتابیں آڑی ترچھی حالت میں پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر ارشاد بے حد شرمندہ ہوا، کیوں کہ وہ اب تک کئی کتابیں اپنی غفلت اور بے پروائی سے گم کر بیٹھا تھا اور یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ کتابیں کسی نے چرا لیں یا کہیں گم ہو گئیں۔

ارشاد کو شرمندہ دیکھ کر ساجد نے پیار سے کہا: ''اب زیادہ شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہی کافی ہے۔ آج سے وعدہ کر لو کہ تم آئندہ اپنی کوئی کتاب گم نہیں ہونے دو گے۔'' ساجد نے کہا تو ارشاد نے مسکرا کر اقرار میں سر ہلا دیا۔ n

لالچ کی سزا

صبور مشتاق حسن۔ کراچی

محمود ایک بڑھئی تھا جس کی دکان سڑک کے چوک میں نیم کے ایک پرانے درخت کے سامنے واقع تھی۔ یہ درخت بہت گھنا تھا جس پر دن بھر مختلف پرندے چہچہاتے رہتے تھے۔

محمود ایک رحم دل انسان تھا۔اس نے لکڑی کی دو کونڈیاں بنا کر درخت کی شاخ سے باندھ دی تھیں۔ایک میں پانی کا برتن رکھا اور دوسری میں باجرہ۔روزانہ صبح دکان پر آتے ہی محمود پہلے پرندوں کے لیے دانہ پانی رکھتا اور پھر اپنا کام شروع کرتا۔

ایک روز محمود نے دیکھا کہ ایک بلی دانہ کھاتے ہوئے ان پرندوں کی تاک میں رہتی تھی، موقع ملتے ہی اس نے کئی چڑیوں کا شکار بھی کیا تھا۔ یہ دیکھ کر محمود نے اس بلی کے لیے بھی چھیچھڑوں کا انتظام کر دیا تھا، تاکہ وہ پرندوں کے لیے خطرہ نہ بنے۔اب روزانہ بلی اپنے حصے کے چھیچھڑے کھا کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھی اونگھتی رہتی یا پھر گلی محلے میں دوڑتی بھاگتی رہتی، لیکن پرندے بڑے آرام سے اپنا دانہ دنکا کھانے آتے اور کھا کر اڑ جاتے۔

بلی کا دل جب چھیچھڑوں سے بھر گیا تو ایک بار پھر پرندوں پر اس کی نیت خراب ہونے لگی۔ کئی روز سے اس کی نظر ایک موٹے تازے کبوتر پر تھی جو روز دانہ کھانے آتا تھا۔بلی یہ دیکھ کر پریشان ہوتی تھی کہ کبوتر اوپر ہی اوپر کونڈی سے دانہ کھا کر اڑ جاتا تھا اور زمین پر نہیں آتا تھا، جبکہ دوسرے پرندے دانہ کھانے کے بعد نیچے زمین پر بھی پھدکتے تھے اور انہی میں سے ایک آدھ بلی کے ہتھے چڑھ جاتا تھا۔بلی نے ایک دوبار درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تو محمود نے اس کو ڈرایا اور کوئی چیز ماردی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ ہفتے کی رات کو محمود دونوں کونڈیاں باجرے اور پانی سے بھر کے جاتا تھا، تاکہ اس دن بھی پرندوں کا پیٹ بھر جائے۔

صبح کے نو بجے تھے۔ چھٹی کی وجہ سے علاقے میں چہل پہل نہیں تھی۔ محمود کی دکان کے سامنے لٹکی ہوئی کونڈیوں سے پرندے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔وہ کبوتر بھی موجود تھا۔بلی پہلے سے ہی درخت کے اوپر والے حصے میں چھپ کر بیٹھی تھی۔

دانہ کھاتے ہوئے جب کبوتر دوسری طرف گھوما تو بلی نے پھرتی سے چھلانگ ماری، مگر اسی وقت کچھ کوے ڈر کر کائیں کائیں کرتے ہوئے اڑے تو کبوتر کو بھی خطرے کا احساس ہوا اور وہ وہاں سے فوراً اڑ گیا۔بلی چھلانگ لگا چکی تھی،اس لیے سیدھی باجرے والی کونڈی میں گری جو بلی کا وزن برداشت نہ کر سکی اور اس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ بلی اور باجرے کی کونڈی ایک ساتھ نیچے زمین پر گرے۔ بلی کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور گردن اور سر پہ بھی چوٹیں آئیں۔ بدقسمتی سے اسی وقت ایک کتے نے بھی بلی پر حملہ کر دیا جس سے بچتی بچاتی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچی تو زخموں سے چور چور تھی۔اس طرح بلی کو اس کے لالچ کی سزا مل گئی۔n

لومڑی پھر بھی نہ بدلی

صبور مشتاق حسن۔ کراچی

کسی جنگل میں گھنے درخت کی کھو میں ایک لومڑی اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ لومڑی بہت جھگڑالو تھی اور سب سے لڑتی رہتی تھی۔ ہر جانور کا مذاق اڑانا اور اس کے عیب نکالنا لومڑی کی عادت تھی۔ مگر جنگل کے باقی جانور بہت رحم دل اور ایک دوسرے کے کام آنے والے تھے۔

ایک روز صبح سویرے لومڑی کے پاس شیر کا ایلچی بندر پہنچا اور کہا: ''تمھیں ابھی اور اسی وقت شیر بادشاہ نے بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔'' لومڑی نے جواب دیا تو بندر نے کہا: ''نہیں، تم خود چلی جاؤ۔ میں تو ابھی شیر کے بچوں کے لیے تازہ ناریل توڑنے جا رہا ہوں۔ شام کو وہ اس کا پانی پئیں گے۔'' یہ کہہ کر بندر آگے چلا گیا۔

لومڑی اپنے بچوں کے پاس آئی جو کھو کے قریب آپس میں لڑ رہے تھے۔ لومڑی نے انہیں شیر کے بلاوے کے بارے میں بتایا اور انھیں کھو میں جانے کی ہدایت کی۔

لومڑی کی بیٹی، اس کی طرح تیز و طرار تھی۔ اس نے کہا: ''اماں! میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''اب تم بڑی ہو رہی ہو، اپنی کھو میں رہا کرو۔ باہر نکلو گی تو شیر یا چیتے کے پیٹ میں پہنچ جاؤ گی۔'' لومڑی نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا اور وہاں سے چلی گئی۔ دوپہر تک لومڑی شیر کے غار کے پاس پہنچی۔ شیر کا خاندان بہت بڑا تھا جس میں دو شیرنیاں اور ان کے نو بچے شامل تھے۔ ان کے کھانے کے لیے شیر کو بڑا جانور شکار کرنا پڑتا تھا۔

جب لومڑی شیر کے بلاوے پر پہنچی تو شیر جنگلی بھینسے کے شکار پر جا چکا تھا۔ ایک شیرنی اپنے غار کے پاس بڑی شان سے بیٹھی تھی اور دوسری اندر اپنا کام کر رہی تھی۔

''آداب شیرنی ملکہ!'' لومڑی نے کہا۔

''تمھیں اس لیے بلایا گیا ہے کہ ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ جہاں تم رہتی ہو وہاں سے دنداسے کی چھال کا ایک بنڈل بنا کر روزانہ صبح سویرے پہنچا دیا کرو، تاکہ بچے اس سے روزانہ دانتوں کو رگڑ کر انھیں نکیلا اور تیز بنائیں۔''

شیرنی کا یہ حکم سن کر لومڑی کی جان ہی نکل گئی، کیوں کہ صبح سویرے جنگل میں اندھیرا ہوتا ہے، ایسے میں اپنے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر درختوں سے چھال اتارنا اور اتنی دور پہنچانا بڑا مشکل کام تھا۔ ابھی لومڑی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ شیرنی بولی: ''اب تم جا سکتی ہو۔'' لومڑی آداب بجالاتی فوراً وہاں سے نکل گئی۔

وہ راستے میں سوچ رہی تھی کہ میرا سلوک دوسرے جانوروں کے ساتھ اتنا خراب ہے کہ میں کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتی۔

اب اسے اپنے خراب رویے کا احساس ہوا تھا۔ اسی دوران راستے میں اسے بکری ملی اور بولی: ''خیریت تو ہے، یہ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

لومڑی نے بکری کو شیرنی ملکہ کے حکم کے بارے میں بتایا تو وہ بولی: ''فکر مت کرو، میں درختوں سے چھال اتار کر اس کا بنڈل بنا دیا کروں گی۔ آگے پہنچانا تمہارا کام ہے۔''

لومڑی ہمیشہ کی بدمزاج تھی، اس لیے بکری کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ''ٹھیک ہے'' کہہ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

راستے میں اسے گدھا ملا تو اس نے لومڑی سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی تو لومڑی نے گدھے کو اپنی پریشانی بتا دی۔

''پریشان نہ ہو، میں تمھیں روزانہ اپنی پیٹھ پر بٹھا کر شیر کے غار کے قریب چھوڑ دوں گا۔'' گدھے نے کہا تو یہاں بھی لومڑی گدھے کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے یہ سوچتی ہوئی اپنے غار میں آگئی کہ ''چلو میری تو مشکل آسان ہوئی۔''

اب روزانہ بکری دنداسے کی چھال کا بنڈل بناتی، لومڑی اسے لے کر گدھے پر سوار ہو جاتی جو اسے شیر کے غار کے پاس اتار دیتا۔ وہاں لومڑی اس بنڈل کو رکھ کر واپس آجاتی۔

کافی دن بعد شیرنی ملکہ نے لومڑی سے کہا: ''اب تمہارا کام ختم، تمہاری اس خدمت کا تمھیں یہ انعام دیا جاتا ہے کہ دو دن تک تم پورے جنگل میں آرام سے گھومو پھرو اور جو چاہو، کھاؤ پیو۔ کسی جانور کی مجال نہیں ہو گی کہ وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔''

یہ حکم ملتے ہی لومڑی خوشی سے جھومتی اپنی کھو میں آگئی۔ اب بھی اسے بکری اور گدھے کا شکریہ ادا کرنے کا خیال نہ آیا۔

مگر لومڑی کے بچوں نے اسے یہ بات یاد دلادی: ''بکری آنٹی اور گدھے انکل کی مدد کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ آیئے چل کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

بچوں کے احساس دلانے پر لومڑی مجبوراً اپنے بچوں کے ساتھ گدھے اور بکری کا شکریہ ادا کرنے پہنچی تو وہ دونوں بولے: ''بی لومڑی! تم بھی ہمارے جنگل کی ہو، ہم مشکل وقت میں تمھیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ہمیں خوشی ہے کہ تمہارا مشکل وقت ختم ہوا اور تمھیں سکون مل گیا۔''

یہ سن کر لومڑی کی گردن اکڑ گئی اور وہ دل میں سوچنے لگی: ''میں نے غلطی کی جو بچوں کے کہنے میں یہاں آگئی، بڑے آئے ڈینگیں مارنے والے!'' ■

لومڑی کا انصاف

محمد حماد خان۔ واہ کینٹ

ایک جنگل میں ایک لکڑہارا رہتا تھا جو روزانہ لکڑیاں کاٹ کر بازار میں بیچ آتا اور اس سے ملنے والی رقم سے گزر بسر کرتا تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اس نے شیر کی دہاڑ سنی تو بری طرح ڈر گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک پنجرے میں بند شیر پر پڑی۔ وہ حیران رہ گیا کہ شیر کو کس نے اور کیسے پنجرے میں بند کر دیا۔ وہ پنجرہ اصل میں کسی شکاری نے رکھا تھا اور شیر اس پنجرے میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ پوری طاقت سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر نکل نہیں پا رہا تھا، اسی لیے بار بار دہاڑ رہا تھا۔

جیسے ہی شیر نے لکڑہارے کو دیکھا تو وہ خوش ہو گیا اور اس سے التجا کرنے لگا: ”لکڑہارے بھائی! مجھے اس پنجرے سے رہا کر دو، میری مدد کرو ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

لکڑہارے نے کہا: ”میں تمہیں اس پنجرے سے کیسے آزاد کر دوں؟ تم آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے کھاؤ گے۔ نہیں بھئی نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

شیر نے عاجزی سے کہا: ”میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بس تم مجھے آزاد کر دو، غار پر میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

شیر نے اپنے بچوں کا نام لیا تو لکڑہارے کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا تو شیر دہاڑتا ہوا اس میں سے باہر نکلا اور لکڑہارے سے بولا: ”میں دو دن سے بھوکا ہوں۔ اب میں پہلے تمہیں کھاؤں گا، تاکہ مجھ میں طاقت آ جائے۔ اس کے بعد اپنے بچوں کے پاس جاؤں گا۔“

اب تو لکڑہارا گھبرا گیا۔ اس نے شیر کی بہت منت سماجت کی، لیکن شیر نہ مانا اور کہتا رہا کہ میں تجھے کھا کر رہوں گا۔

آخر لکڑہارے نے اس سے کہا: ”آؤ کسی سے فیصلہ کرا لیتے ہیں۔“

شیر بھی راضی ہو گیا اور دونوں کسی منصف کی تلاش میں نکلے۔

جنگل میں ان کی ملاقات ایک خرگوش سے ہوئی۔ لکڑہارے نے اسے پوری بات بتائی تو خرگوش نے سوچا کہ اگر میں نے شیر کا ساتھ نہ دیا تو یہ مجھے کھا جائے گا، چناں چہ اس نے فیصلہ شیر کے حق میں دے دیا جسے سن کر شیر خوش ہو گیا۔

اتنے میں ان دونوں کے پاس سے زیبرا گزرا تو لکڑہارے نے اس کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا۔ وہ بھی شیر سے ڈرتا تھا، اس لیے اس نے بھی شیر کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ دیکھ کر لکڑہارا بالکل مایوس ہو گیا۔

ایک لومڑی دور سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کے قریب آ کر کہا: ”کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے ناں؟“

لکڑہارے نے اس کو ساری بات بتائی تو لومڑی نے کہا: ”میں نہیں مان سکتی کہ جنگل کا بادشاہ اور پنجرے میں بند! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو اس بات پر بالکل یقین نہیں ہے۔“

شیر اور لکڑہارے نے لومڑی سے کہا: ”آؤ ہم تمہیں وہ پنجرہ دکھاتے ہیں۔“ وہ دونوں لومڑی کو اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے جہاں وہ پنجرہ اب بھی رکھا تھا۔

لومڑی نے پنجرہ دیکھتے ہی کہا: ”یہ تو بہت چھوٹا ہے، اس میں جنگل کا بادشاہ شیر کیسے بند ہو سکتا ہے؟“

یہ سنتے ہی شیر فوراً پنجرے میں گھس گیا اور کہا: ”دیکھو، میں اس طرح اس پنجرے میں قید تھا۔“

لومڑی نے جھٹ سے پنجرہ بند کر دیا تو شیر نے کہا: ”یہ کیا کر رہی ہو، مجھے تو باہر نکالو۔“

لومڑی نے کہا: ”ایک وعدہ خلاف اور احسان فراموش کی یہی سزا ہے۔ اس بے چارے غریب لکڑہارے نے تم پر احسان کیا، تمہاری جان بچائی اور تم اسی کو مار کر کھانا چاہتے ہو۔ اب تم اس پنجرے میں بند رہو گے۔“

شیر نے لومڑی اور لکڑہارے دونوں کی بہت منت سماجت کی، مگر نہ لومڑی اس کی باتوں میں آئی اور نہ اس بار لکڑہارے کو اس پر ترس آیا۔ دونوں شیر کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔n

مگرمچھ کی قربانی

مریم فاطمہ۔ کراچی

بہت پرانی کہانی ہے۔ کسی تالاب میں ایک بے بی مگرمچھ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔اس تالاب میں اس کے علاوہ بیس مگرمچھ اور بھی رہتے تھے۔ لیکن بے بی مگرمچھ کی دم بڑی خوب صورت اور چمک دار تھی جسے دیکھ کر اسی تالاب میں رہنے والے دوسرے مگرمچھ اس سے جلتے تھے،کیوں کہ ان کی دمیں نہ تو خوب صورت تھیں اور نہ ہی چمک دار۔وہ سب چاہتے تھے کہ کسی طرح بے بی مگرمچھ اپنی پیاری دم سے محروم ہو جائے۔ایک روز بے بی مگرمچھ نے اپنی جلد پر موجود تمام چمک دار scales کی گنتی کی تو وہ یہ جان کر خوش ہوا کہ وہ لگ بھگ ایک ہزار تھے۔ scales کو اردو میں کھپرے یا چھلکے بھی کہتے ہیں جو مگرمچھ کی کھال کے اوپر ہوتے ہیں۔انہی سے اس کی پوری جلد بنتی ہے۔ بے بی مگرمچھ سوچنے لگا کہ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ پھر اس نے دوسرے مگرمچھوں کی جلد پر موجود کھپرے یا چھلکے بھی گننے شروع کیے،ان میں اس کے ماں باپ سمیت تمام بڑے مگرمچھ شامل تھے۔ بے بی مگرمچھ کو اس وقت بہت حیرت ہوئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان سب کی جلد پر موجود کھپروں کی تعداد تو بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہے۔وہ سوچنے لگا کہ میری جلد پر موجود کھپرے ضرورت سے زیادہ ہیں،اگر ان میں کچھ کمی ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ میں یہ فالتو کھپرے اپنے ماں باپ اور اپنے ساتھیوں کو دے دوں گا۔ چناں چہ اس نے خدا سے دعا کی کہ میرے پیٹ پر موجود چالیس کھپرے صبح تک میرے تکیے پر جھڑ جائیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔وہ روز خدا سے دعا کر کے سوتا تھا، مگر اس کے تمام کھپرے پہلے کی طرح اس کی جلد پر موجود تھے۔اس طرح تین ہفتے گزر گئے ، مگر اس کے کھپروں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ پھر ایک دن تو عجیب سی بات ہو گئی،اس کے تالاب میں نہ جانے کہاں سے ایک بزرگ مگرمچھ آ گیا اور اس نے بے بی مگرمچھ سے کہا کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ تم آج رات کو خدا سے دعا کر کے سونا، صبح تمہارا کام ہو جائے گا۔ بے بی مگرمچھ نے ایسا ہی کیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اس کے تکیے پر پورے چالیس خوب صورت اور چمک دار کھپرے پڑے تھے۔ چناں چہ بے بی مگرمچھ نے ان میں سے دو دو کھپرے تالاب میں رہنے والے تمام بیس مگرمچھوں کو دے دیے جن میں اس کے اپنے ماں باپ بھی شامل تھے۔ اس دن کے بعد سے اس تالاب کا ہر مگرمچھ بے بی مگرمچھ سے پیار کرنے لگا۔اس کے ماں باپ تو پہلے ہی اسے بہت چاہتے تھے، مگر اب وہ اپنے بیٹے پر فخر کرنے لگے۔ بے بی مگرمچھ نے اپنے ماں باپ اور تالاب میں رہنے والے دوسرے مگرمچھوں کی خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی جسے مگرمچھ آج تک نہیں بھول سکے ہیں۔n



مریم کی گڑیا

عائشہ رانا...... کراچی

"فائزہ! جلدی آؤ، ہمیں گڑیا کے کپڑے بھی سینے ہیں۔" مریم نے فائزہ سے کہا۔

"بس ابھی آئی۔" فائزہ نے جواب دیا۔ گھر میں خوب چہل پہل تھی، مریم کے سب کزنز اس کے گھر جمع ہوئے تھے کیونکہ آج مریم کی گڑیا کی سالگرہ تھی۔

آج کے دن ہی مریم کے ابو وہ گڑیا لائے تھے اس لئے آج وہ اس کی سالگرہ منا رہی تھی۔ مریم کی کزنز فائزہ، فاطمہ اور ماہ نور برتھ ڈے والا کمرہ سجانے میں مصروف تھیں جبکہ مریم کے کزنز عثمان، علی، زید اور عبداللہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ مریم کی سب کزنز نے کمرے کو بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا، کیک بھی باہر سے منگوالیا تھا اور کچھ اور کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود تھیں۔

ابھی دوپہر کے تین بج رہے تھے، جبکہ برتھ ڈے پارٹی چار بجے شروع ہونی تھی۔ مریم نے اپنی کزنز کی مدد سے کھانے پینے کی چیزیں اور کیک ٹیبل پر رکھ دیا۔ مریم نے ایک نظر کمرے پر دوڑائی اور کہا۔ "باقی سب کام تو ہو چکے ہیں، بس گڑیا کا سوٹ ابھی مکمل ہونا ہے، چلو پھر جلدی سے گڑیا کے کپڑے مکمل کرو تاکہ ہم گڑیا کو تیار کریں، آخر آج اس کی سالگرہ ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ سب نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر نکل آئیں۔ سب امی کے کمرے میں پہنچ گئیں اور سلائی مشین کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ "تم نے اپنی امی سے اجازت تو لے لی ہے نا؟" فائزہ نے دریافت کیا۔ "ہاں...... ہاں فکر مت کرو، میں نے امی سے پوچھ لیا ہے کہ میں گڑیا کے کپڑے سی لوں، انہوں نے اجازت دے دی ہے۔" مریم نے جواب دیا۔ "گڑیا کے کپڑے تو بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔" ماہ نور نے کپڑوں کی تعریف کی، دوسروں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "گڑیا تیار ہے، اسے برتھ ڈے والے کمرے میں رکھ کر سب میرے کمرے میں آ جانا، ہم بیٹھ کر تھوڑی باتیں کریں گے، پھر چار بجے پارٹی شروع کر دیں گے۔" مریم نے سب سے کہا۔ جیسا مریم نے کہا تھا، سب نے ویسا ہی کیا اور اس کے کمرے میں جمع ہو گئیں۔ وہاں سب باتیں کرنے لگ گئیں۔ اب چار بج چکے تھے۔ فاطمہ نے کہا۔ "میں جا کر عثمان، علی، عبداللہ اور زید کو بلا کر لے آتی ہوں تاکہ وہ بھی برتھ ڈے پارٹی میں شریک ہو سکیں۔" یہ کہہ کر فاطمہ سب کو کمرے میں لے آئی جہاں وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سب برتھ ڈے والے کمرے کے باہر موجود تھے، کمرے کی لائٹ بند تھی۔ مریم نے دروازہ کھولا اور لائٹ جلائی۔ کمرے کو دیکھ کر تو سب حیران و پریشان ہو گئے۔ وہاں انہوں نے کیک اور گڑیا رکھی تھی، وہ اب وہاں موجود نہیں تھی، پھول وغیرہ سب فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ "ارے ہم نے تو یہیں کیک اور گڑیا رکھی تھی، یہاں سے سب چیزیں غائب کیسے ہو گئیں؟ اور یہ کمرے کا حال کس نے کیا ہے؟" سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ جب سب لڑکیاں پریشان کھڑی تھیں، تب فاطمہ نے عثمان اور عبداللہ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ سب انہی لڑکوں کا کیا دھرا ہے۔

فاطمہ نے مریم کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ "یہ سب کچھ ان لڑکوں کی کارستانی ہے۔" فاطمہ نے مریم کو بتایا۔ "مگر تمہیں کیسے پتا؟" مریم نے پوچھا۔ "جب ہم گڑیا کو کمرے میں ڈھونڈ رہے تھے تب یہ لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے، یہ سب انہوں نے ہی کیا ہوگا۔" فاطمہ نے کہا۔ "چلو ان سے چل کر پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔" مریم نے فاطمہ سے کہا۔ "ارے رکو......! ابھی ان سے کچھ مت پوچھو، ویسے بھی یہ لوگ اتنی آسانی سے ہمیں گڑیا نہیں دیں گے، ہمیں کوئی ترکیب سوچنی ہوگی۔" فاطمہ نے کہا۔

"[illegible] ایک ترکیب آئی ہے۔" مریم نے کہا۔ مریم نے فاطمہ کو ترکیب بتائی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ پہلے انہوں نے زمین پر بکھرے پھول سمیٹ پھر کمرے کو ٹھیک کیا۔ اب کمرہ پہلے کی طرح صاف ستھرا اور خوبصورت لگ رہا تھا۔

"برائے مہربانی سب اسی کمرے میں انتظار فرمائیں، ہم بس ابھی آتے ہیں۔" یہ کہہ کر مریم نے سب لڑکیوں کو باہر بلایا۔ اب کمرے میں صرف عثمان، علی، عبداللہ اور زید تھے۔ فاطمہ نے لڑکیوں کو سارا معاملہ بتایا۔ مریم کہنے لگی۔ "ویسے تو یہ سب کے سب پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں لیکن ان کی شرارتیں تو دیکھو آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔" فائزہ نے کہا۔ "ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہماری گڑیا اور کیک انہوں نے کہاں چھپایا ہے؟" اس پر فاطمہ نے انہیں ترکیب بتائی۔ اگلے ہی لمحے ترکیب پر عمل شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں برتھ ڈے والے کمرے میں آئیں اور ان لڑکوں سے جنہوں نے اپنی شرارت سے انہیں پریشان کر رکھا تھا، کہا۔ "ہمیں پتا چل گیا ہے کہ تم لوگوں نے ہی ہمارا کیک اور گڑیا کہیں چھپائی ہے، ہمیں جلدی سے وہ واپس کر دو۔" یہ سن کر چاروں شرارتی لڑکے ہنسنے لگے اور کہا۔ "ہم تو وہ چیزیں واپس نہیں کریں گے۔"

"دیکھو ہمیں وہ چیزیں واپس کر دو ورنہ......!" فاطمہ نے کہا۔ "ورنہ کیا کریں گی آپ فاطمہ باجی! بتائیں؟" شرارتی لڑکے بے خوفی سے بولے۔ "ورنہ ہم بھی تمہارا ویڈیو گیم جو تم لوگ بڑے شوق سے کھیلتے ہو، واپس نہیں کریں گے۔" لڑکیوں نے فیصلہ سنایا۔ "کیا...... کیا کہا آپ نے...... ہمارا ویڈیو گیم آپ کے پاس ہے؟" اب شرارتی لڑکے تھوڑا پریشان ہوئے۔ "ہاں ہم نے تم لوگوں کا ویڈیو گیم چھپا دیا ہے اور وہ تم لوگوں کو تب تک واپس نہیں ملے گا جب تک ہمیں ہماری گڑیا نہیں ملے گی۔" لڑکیوں نے کہا۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی، آپ نے ہمارا گیم کیوں چھپایا؟" فائزہ نے جواب دیا۔

"ارے ویڈیو گیم تو چھوڑو، ابھی تو تمہاری خالہ یعنی میری امی سے ڈانٹ بھی پڑنی باقی ہے۔" مریم نے کہا۔ "مریم کی امی سے تو تم لوگ ڈانٹ سنو گے ہی، اگر تم نے ہماری چیزیں واپس نہ کیں تو تم لوگوں کی امی یعنی ہماری خالہ صفیہ بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی پھر ان کی بھی ڈانٹ سننا۔" فائزہ نے لڑکوں سے کہا۔ "نہیں...... نہیں پلیز! ہمیں ڈانٹ مت پڑوانا، ہم ابھی آپ کو آپ کی چیزیں لا کر دیتے ہیں۔" اسی وقت زید اور عبداللہ گئے اور برتھ ڈے کیک اور گڑیا لا کر مریم کو دے دی۔ "سوری......! ہمیں آپ سب کو اتنا تنگ نہیں کرنا چاہئے تھا، اب ہم آئندہ ایسی شرارت نہیں کریں گے۔" عثمان، عبداللہ، علی اور زید نے اپنی باجیوں سے کہا۔ "کوئی بات نہیں، چلو اب جلدی سے کیک کاٹیں۔" مریم نے کہا اور سب برتھ ڈے پارٹی منانے میں مصروف ہو گئے۔

محنت بھی ضروری ہے

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

سمیع بہت پیارا اور ذہین بچہ تھا۔ ہر کوئی اس کی ذہانت کی تعریف کرتا تھا، کیوں کہ وہ ہمیشہ جماعت میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کی کارکردگی بہت اعلیٰ ہوتی تھی۔ وہ بہت صاف ستھرا ہوم ورک کرتا تھا، اس کی تحریر یعنی لکھائی بھی بہت خوب صورت تھی۔ وہ حساب کے تمام سوالات جلد حل کرلیتا تھا۔ لمبے لمبے سبق جلد یاد کرلیتا تھا، یہ ایسی خوبیاں تھیں جن کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیلنے کے وقت کھیل ہی اس کی عادت تھی۔

مگر آج کل سمیع کچھ دیر کھیلنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے اجازت چاہتا تھا اور کبھی کہتا تھا کہ مجھے ہوم ورک کرنا ہے اور کبھی کہتا کہ ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔ اس کی بات سن کر اس کے ساتھی کہتے: "ارے بھئی تم تو ویسے بھی بہت ذہین ہو، ذرا سی دیر میں سب کچھ یاد کرلیتے ہو، تھوڑا سا اور کھیل لو، پھر چلے جانا۔"

اپنے ساتھیوں کے اصرار پر سمیع مزید کھیلنے کے لیے راضی ہو جاتا اور ان کے ساتھ مصروف ہو جاتا۔ ساتھی بھی خوش ہو جاتے کہ اس نے ان کی بات مان لی۔

کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ وہ اسکول کے کام میں مصروف تھا کہ امی نے اسے مارکیٹ جاکر سبزی لانے کے لیے کہا تو وہ بولا: "امی! میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔"

اگر وہ دوبارہ کہتیں تو سمیع کہتا: "اچھا، میں کچھ دیر بعد چلا جاؤں گا، فی الحال مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔"

یہ سن کر امی کہتیں: "بیٹے! تم تو اتنے ذہین ہو کہ ذرا سی دیر کے لیے اٹھنے سے تمھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مارکیٹ سے واپس آکر ٹیسٹ کی تیاری کرلینا۔ تمھیں ٹیسٹ کی تیاری کے لیے کونسا گھنٹوں چاہئیں۔"

امی کی بات سن کر سمیع خوش ہو جاتا اور مارکیٹ چلا جاتا۔ لیکن اس کا ایک نقصان بھی سمیع کو پہنچ رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھتی چلی جارہی تھی کہ وہ بہت ذہین ہے اور ذرا سی دیر میں سب کچھ کرلے گا۔ اس کا ایک خراب نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب خود سمیع نے بھی بے پروائی دکھانی شروع کردی۔ شام کے وقت عموماً ایسا ہوتا کہ سمیع اسکول کا سبق یاد کر رہا ہوتا تو اس کے شرارتی اور غیر سنجیدہ دوست اسے کھیلنے کے لیے بلانے آجاتے اور سمیع کتابیں کاپیاں چھوڑ کر ان کے ساتھ دوڑا چلا جاتا اور خوب کھیلنے کے بعد ہی لوٹتا تھا۔ جب اس بات پر امی ابو اس سے جواب طلب کرتے تو وہ کہتا: "آپ چاہتی ہیں ناں کہ میں کلاس میں نمایاں پوزیشن لوں تو بس آپ اس کی فکر نہ کریں، یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، جو سبق باقی بچے گھنٹوں میں یاد کرتے ہیں، مجھے اس کے لیے صرف پندرہ منٹ درکار ہوتے ہیں۔" وہ مغرور لہجے میں کہتا تو والدین بھی اس کی بات پر یقین کرکے مطمئن ہو جاتے، کیوں کہ وہ واقعی ذہین تھا اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی پڑھائی میں مدد کرتا تھا۔ یوں اس میں حد سے زیادہ خود اعتمادی غرور کی حد تک پہنچنے لگی۔

کئی بار اس کے ابو نے اس کی امی سے کہا تھا: "بیگم! بچے کے منہ پر اس کی ذہانت کی تعریف کرنا اس کو بگاڑنا ہے۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی ٹھیک نہیں۔" سمیع کی امی اپنے شوہر کی بات سن کر چپ ہو جاتی تھیں، انہوں نے نہ کبھی سمیع کو اس کے رویے پر ٹوکا تھا اور نہ اپنے شوہر کی بات کو اہمیت دی تھی۔

مگر چوں کہ سمیع نے ابھی تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا، اس لیے سمیع اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ اب تو اس نے کھیل کود میں دلچسپی بڑھادی تھی اور تعلیم میں کم کردی تھی۔

پھر سالانہ امتحانات کا نتیجہ آیا تو توقع کے برعکس سمیع کا نام کلاس میں سب سے کم نمبر حاصل کرنے والوں میں شامل تھا۔ یہ دیکھ کر سمیع کو بہت شرمندگی ہوئی اور اسے ابو کی بات کا یقین ہو گیا کہ حد سے زیادہ خود اعتمادی بے وقوفی ہے۔ تعلیمی کامیابی کے لیے صرف ذہانت ہی نہیں، بلکہ مسلسل محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔n

میں درخت ہوں

عبادالرحمٰن۔ کراچی

اللہ نے جہاں آپ لوگوں کو بہت سی نعمتیں یعنی ہوا، پانی، دھوپ وغیرہ عطا کیے ہیں، وہاں اس نے مجھے بھی آپ کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لوگ مجھے بے جان سمجھتے ہیں، لیکن میں نہ صرف جان دار ہوں اور سانس لیتا ہوں، بلکہ آپ کے سانس لینے کے عمل میں بھی آپ کی مدد کرتا ہوں۔ میں گندی ہوا جذب کر کے آپ لوگوں کو تازہ اور صاف ہوا فراہم کرتا ہوں۔ جی ہاں میں ایک درخت ہوں۔ آپ سوچیں کہ کس طرح ایک ننھے سے بیج سے میری پیدائش ہوتی ہے اور کس طرح میں سخت زمین کو چیرتا ہوا باہر نکل آتا ہوں۔ میں گرمی کے موسم میں آپ کے لیے چھاؤں فراہم کرتا ہوں۔ ہر موسم کے پھل اور میوے آپ کو دیتا ہوں جن میں صحت کا خزانہ ہوتا ہے۔ آپ کے گھروں میں جو کرسیاں، میزیں، دروازے اور کھڑکیاں ہیں، وہ بھی میری لکڑی سے ہی بنتی ہیں ۔ گاؤں دیہات میں میری لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میں بچوں کا دوست ہوں۔ کاغذ بھی مجھ سے ہی بنایا جاتا ہے۔ قلم پینسل بھی میں ہی آپ کو دیتا ہوں اور گوند بھی۔ آپ لوگوں کو میری قدر کرنی چاہیے۔ میری ہی وجہ سے زمین پر خوب صورتی اور ہریالی نظر آتی ہے۔ جس شہر اور گاؤں میں میری کثرت ہوتی ہے، وہاں کا ماحول خوش گوار رہتا ہے۔ میں جہاں ہوتا ہوں، وہاں گرمی کو کم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میری ہی وجہ سے بارشیں برستی ہیں۔ خوب صورت اور رنگ برنگے پرندے بھی میری ہی شاخوں پر اپنا گھر بناتے ہیں۔ میرے ہی پھلوں، پھولوں، پتوں، بیجوں اور جڑوں سے دوائیں بنائی جاتی ہیں۔ بعض بچے درختوں کو بڑی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ وہ راہ چلتے میری ٹہنیاں اور پتے نوچتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اس سے ہمیں کتنی تکلیف ہوتی ہے ۔ آپ لوگوں کو ہماری حفاظت، دیکھ بھال اور قدر کرنی چاہیے، کیوں کہ ہم آپ کے لیے ایک بڑی نعمت ہیں۔ n

میں سپرمین نہیں ہوں

عنایت اللہ شاکر۔ وہوا

حسن کو اس کے دوست سپر مین کہتے تھے۔ لمبا قد، سیاہ گھنے بال، سرخ سفید رنگ اور نیلی آنکھیں، وہ لگتا بھی بالکل سپر مین تھا!

سپر مین! کیا کر رہے ہو، سپر مین آج ہمارے ساتھ چائے پیو، سپر مین ہمیں بھی کچھ لفٹ کرا دو۔ حسن اکثر ایسی باتیں سنتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے ساتھ بیٹھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ ساتھی طالب علم اس جیسا بننے کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن اس میں ایک بڑی خرابی یہ تھی وہ امتحان کے وقت سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ موٹر سائیکل پر لمبی ڈرائیو اور کمپیوٹر پر چیٹنگ اس کے دل چسپ مشغلے تھے۔ کتابوں سے اسے شاید دشمنی تھی۔ امتحان کے وقت وہ انھیں ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذہانت کی دولت سے نوازا تھا لیکن وہ پڑھائی کے علاوہ زندگی کے ہر معاملے میں اس کا بھرپور استعمال کرتا۔ اس کے اساتذہ کا کہنا تھا کہ اگر وہ اپنی فضول مشغولیات چھوڑ کر پڑھائی میں دل لگائے تو وہ بہت آگے جاسکتا ہے۔ سالانہ امتحان میں چند ہفتے باقی تھے کہ اس نے اچانک یہ اعلان کر دیا: ”انشاءاللہ اس بار میں کلاس میں فرسٹ آؤں گا۔“

یہ سن کر اس کے سبھی ساتھی حیران رہ گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ حسن جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ آخر امتحان شروع ہوگئے۔ پہلا پرچہ، دوسرا پرچہ پھر کئی پرچے ہوگئے۔ سپر مین نے سبھی کو حیران کر دیا۔ اسے ہر پرچے کے دوران سر اٹھانے کی فرصت نہ ملی۔

اس نے امتحان کی تیاری کے ساتھ پانچ وقت کی نماز بھی بڑی پابندی سے شروع کر دی تھی۔ ہر نماز کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اپنی کامیابی کی دعائیں مانگتا تھا۔ دوسری طرف عمران پہلی جماعت سے ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ پوری کلاس کا خیال تھا کہ وہ اس سال بھی فرسٹ آئے گا۔ نتیجے والے دن عمران اور حسن کے چہرے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے عمران مطمئن تھا، کیوں کہ اس کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے۔ ادھر حسن (سپر مین) پریشان تھا کہ اگر وہ فرسٹ نہ آیا تو بڑی سبکی ہوگی۔ نتیجے والے دن سب دل تھامے بیٹھے تھے۔ پھر اعلان ہوا کہ عمران اور حسن دونوں پورے اسکول میں فرسٹ آئے ہیں۔ جب حسن سے اس کامیابی کی وجہ معلوم کی گئی تو اس نے کہا: ”میں نے سورۃ النجم کی آیت 24 اور 25 کا ترجمہ پڑھا تھا: جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے، وہ اسے ضرور ملتی ہے آخرت اور دنیا تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ بس اسی دن میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ فرسٹ آنے کے لیے محنت کروں گا اور میں نے رات دن ایک کر دیے۔ مجھے اپنے فرسٹ آنے کی اتنی خوشی نہیں جتنی عمران کے فرسٹ آنے کی ہے، کیوں کہ اس نے میرے مقابلے میں زیادہ محنت کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی کامیابی سے نوازا۔“

یہ سن کر اس کی کلاس کے تمام لڑکوں نے ”سپر مین زندہ باد“ کے نعرے لگائے تو حسن نے کہا: ”آج سے مجھے کوئی سپر مین نہ کہے، سب سے اعلیٰ اور برتر تو اللہ کی ذات ہے۔“ n

مینڈکی اور کالا گدھ

عنبر بیگم۔ کراچی

جنوبی امریکا کے بلند پہاڑی سلسلے کوہ انڈیز میں شفاف پانی کا ایک پیارا سا چشمہ تھا جس میں ایک مینڈکی اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہتی تھی، مگر اس کا دایاں پنجا بائیں پنجے سے ذرا سا بڑا تھا۔ وہ جب بھی چشمے کے پانی میں اس کا عکس دیکھتی تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ وہ سوچتی کہ اگر میرے دونوں پنجے برابر ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس چشمے کے قریب غار میں ایک بڑے کالے گدھ کا گھونسلا تھا جس میں سیلی نام کی ایک چرواہی لڑکی رہتی تھی۔ کالا گدھ اسے کہیں سے اٹھا لایا تھا اور زبردستی اس سے اپنے گھونسلے کے کام کراتا تھا۔ سیلی سارا دن کالے گدھ کی خدمت کرتی تھی۔ وہ اس کے لیے جانوروں کی کھالوں سے بستر تیار کرتی، اس کا کھانا پکاتی، مگر گدھ ہمیشہ بھوکا ہی رہتا تھا۔

مینڈکی اس لڑکی کو بھی دیکھتی اور فضا میں تیرتے کالے گدھ کو بھی جو ہر وقت شکار کی تلاش میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار مینڈکی سیلی اور گدھ کی باتیں بھی سنتی تھی۔ ایک روز گدھ نے لڑکی سے اپنے نئے بستر کے بارے میں پوچھا تو لڑکی نے کہا: تیار ہے، پھر کھانے کے بارے میں پوچھا تو لڑکی نے بتایا: وہ بھی تیار ہے۔ اس کے بعد سیلی بولی: ”مجھے اپنے کپڑے دھونے چشمے پر جانا ہے۔“

”کیا؟ تم یہاں سے بھاگنا چاہتی ہو۔؟“ کالے گدھ نے کرخت آواز میں کہا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ لڑکی نے کہا: ”میں چشمے پر کپڑے اس طرح دھوؤں گی کہ انہیں چٹان پر پٹخ پٹخ کر صاف کروں گی۔ تم یہ آواز سنتے رہنا، تاکہ تمہیں تسلی رہے کہ میں یہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے، لیکن اگر تم نے چالاکی دکھائی تو مجھے تم تک پہنچنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔“

اس کے بعد سیلی اپنے کپڑے لے کر چشمے کی طرف چل پڑی۔ وہ چشمے کے پانی میں کپڑے دھوتی رہی اور روتی بھی رہی۔ وہ بدقسمتی سے اس ظالم گدھ کی غلام بن گئی تھی اور اب اس سے رہائی کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

”تم روکیوں رہی ہو؟“ ایک مدھم سی آواز سن کر سیلی نے گھوم کر دیکھا تو اسے چٹان پر ایک مینڈکی نظر آئی جو اسے بڑی ہمدردی سے دیکھ رہی تھی۔ مینڈکی کا پیار دیکھ کر سیلی نے اپنی پوری کہانی اسے سنادی۔

مینڈکی نے کہا: ”تم فکر مت کرو، میں تمہاری مدد کروں گی۔“

”اس دنیا میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ سیلی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”مگر میں تمہاری مدد کروں گی۔“ مینڈکی پھر بولی: ”مجھے ایک جادو آتا ہے جس کے ذریعے میں چند لمحوں کے لیے دنیا کی کسی بھی مخلوق کا روپ دھار سکتی ہوں۔ میں اپنا روپ بدل کر تمہارے روپ میں آجاؤں گی۔ اس دوران تم مسلسل کپڑے دھوتی رہنا، گدھ سمجھے گا کہ تم یہیں ہو، مگر تم یہاں سے بھاگ جانا اور تمہاری جگہ میں کپڑے دھوتی رہوں گی۔“

”مینڈکی! اس میں بڑا خطرہ ہے۔“ سیلی نے ڈرتے ہوئے کہا تو مینڈکی نے اسے جواب دیے بغیر اپنا روپ بدل ڈالا۔ اب وہاں ایک کی جگہ دو سیلی کھڑی تھیں۔

”جلدی کرو، یہاں سے بھاگ جاؤ۔“ مینڈکی نے سیلی سے کہا تو وہ فوراً بھاگنے لگی اور مینڈکی اس کی جگہ کپڑے دھونے لگی۔ یہ آواز کالے گدھ کو بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ مطمئن تھا۔ ادھر سیلی اپنے گھر کی طرف پوری قوت سے بھاگی چلی جارہی تھی۔ وہ پہاڑوں اور وادیوں سے گزرتی ہوئی اپنے گھر کے قریب پہنچ گئی۔

چشمے پر سیلی کی جگہ اس کے روپ میں مینڈکی کافی دیر سے اپنا کام کر رہی تھی۔ کالا گدھ غصے میں اڑا اور چشمے کے قریب ایک چٹان پر اترتے ہوئے چیخا: ”ختم کرو اپنا کام، جلدی واپس آؤ۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔“

سیلی کے روپ میں کام کرنے والی مینڈکی نے گدھ کو دیکھتے ہی چشمے میں چھلانگ لگادی۔ گدھ اس کی طرف جھپٹا تو اسے پانی میں لڑکی دکھائی نہ دی، بلکہ ایک مینڈک تیرتا نظر آیا۔ گدھ غصے سے پاگل ہو گیا، وہ ادھر ادھر اڑتا ہوا لڑکی کو تلاش کرتا رہا، مگر وہ نہ ملی۔ مایوس ہو کر کالا گدھ واپس آگیا۔

مینڈکی جب اپنے چشمے پر پہنچی تو اسے دیکھ کر اس کے بہن بھائی بہت خوش ہوئے۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ مینڈکی کا دایاں پنجا جو بائیں پنجے سے بڑا تھا خود ہی ٹھیک ہو گیا، اب دونوں پنجے برابر تھے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ n

میرا دوست طوطا

محمد عظیم نظامی ۔ لاہور

[illegible] حسبِ
معمول خالد اسکول جا رہا تھا کہ
اچانک اسے راستے میں پڑا ایک زخمی طوطا نظر آیا، جسے اس نے بغیر سوچے سمجھے اٹھایا اور گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر اپنی امی کو دکھایا جو گھر کے کام کر رہی تھیں۔ امی نے جب اس طوطے کو دیکھا تو انہیں بہت دکھ ہوا کیونکہ ایک تو اسے اچھی دوائی نہیں لگا سکتیں اور دوسرا یہ کہ اس کی ننھی جان کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ خالد ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اسی لیے امی نے اس طوطے کی ٹانگ سے چبا ہوا کانٹا نکال دیا اور

رات کی رکھی ہوئی روٹی اسے ڈال دی اور طوطے نے بھی اسے کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور پانی پیا۔ خالد روزانہ اسکول سے آ کر جلدی جلدی ہوم ورک کرتا اور پھر باقی وقت طوطے کے ساتھ گزارتا۔ خالد کے امی ابو بھی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتے کہ طوطے کے آنے کے بعد وہ پڑھائی میں بہت اچھا ہو گیا تھا اور اب تو وہ امتحان میں بھی اول نمبر لایا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے رہے، طوطے کا زخم ٹھیک ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر خالد بہت خوش ہوا کہ اس کا طوطا ٹھیک ہو جائے گا، اس نے سوچا اب میں اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا کہ میرے پاس بھی ایک طوطا ہے اور یہ بولنے والا طوطا ہے۔ اب خالد کے ابو روزانہ امرود اور آٹا لانے لگے۔ خالد یہ بھی دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اب اس کا طوطا تندرست ہونے لگا ہے۔ خالد نے ایک دن

[illegible]
اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے لے گیا۔
سارے دوست دیکھ کر حیران تھے کہ خالد کے پاس طوطا ہے، ہمت کر کے اس کے ایک دوست امجد نے اس سے پوچھا کہ تم یہ طوطا کہاں سے لائے ہو تو آخر کار خالد نے بول ہی دیا کہ مجھے یہ طوطا جنگل سے ملا ہے۔ سب حیران تھے کہ جنگل سے؟ تو خالد نے ساری روداد بتا دی اور پھر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر جا کر کھانا کھایا اور طوطے کو کھلایا اور سو گیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا، اب طوطا اداس تھا نہ کچھ کھاتا اور نہ ہی کچھ پیتا تھا۔ جب خالد نے یہ بات اپنے امی ابو کو بتائی تو امی



بولیں! بیٹا اگر تم ہم سے دور ہو جاؤ تو کیا تمہیں ہماری یاد نہیں آئے گی، ہو سکتا ہے کہ طوطے کو اپنے امی ابو یاد آ رہے ہوں۔ اتنا کہنا تھا کہ ابو بولے! تم اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے تم اسے لائے تھے، وہیں اس کے امی ابو رہتے ہوں گے۔ اگلے ہی روز خالد نے طوطے کو جنگل میں چھوڑ دیا، تھوڑی دیر میں دو تین طوطے، خالد کے طوطے کے گرد جمع ہو گئے اور خوشی خوشی ایک سمت روانہ ہو گئے۔ خالد ان طوطوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ امی اور ابو درست کہتے تھے کہ سچی خوشی تو اپنوں کے ساتھ ہے۔ جیسے میں اپنے امی ابو کے ساتھ خوش ہوں، ویسے ہی میرا دوست طوطا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش ہے، ہم اپنی خوشی کے لیے ان کی آزادی سلب نہیں کر سکتے، یہ اچھی بات نہیں۔

میرا پیارا دوست

حسنین عباس۔ بھلوال ضلع سرگودھا

عباد اور عابد دونوں دوست بھی تھے، ایک دوسرے کے پڑوسی بھی اور ہم جماعت بھی۔ عباد بہت ذہین تھا جب کہ عابد عام سا مگر محنتی طالب علم تھا۔ عباد میں ایک خامی یہ تھی کہ وہ دوسروں پر طنز کرتا تھا اور عابد کو بھی اس کے کند ذہن ہونے کا احساس دلاتا جس کی وجہ سے عابد پریشان رہتا اور اکثر عباد سے دوستی ختم کرنے کا ارادہ بھی کرتا تھا، مگر کافی چاہنے کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر سکا۔ شاید عباد کا ساتھ اس کی مجبوری بن چکا تھا۔

ایک دفعہ ان کے ہیڈ ماسٹر سر جنید ظہیر نے کلاس میں طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ”دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ اگر ہمارے ارد گرد والے لوگ کوئی چیز حاصل کر سکتے ہیں تو یقیناً ہم بھی اسے حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

عابد گھر آیا تو وہ ایک نئے جذبے سے سرشار تھا۔ اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا اور پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا۔ کچھ عرصے بعد دونوں کے امتحانات ہونے والے تھے۔ عباد جب عابد کو یوں پڑھتا دیکھتا تو کہتا: ”اگر اتنی محنت کے بعد بھی پیچھے ہی رہنا ہے تو پھر اس ساری محنت کا کیا فائدہ؟“

اس کی طنز بھری باتیں سن کر عابد کا دل تو ضرور دکھتا تھا، مگر وہ چپ رہتا اور عباد کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ پھر امتحان کا دن بھی آ پہنچا۔ دونوں کمرۂ امتحان میں پہنچے۔ پرچہ دیکھتے ہی عابد کو ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی، کیوں کہ اس پرچے میں جو کچھ پوچھا گیا تھا، وہ سب عابد کو آتا تھا۔

ایک ہفتے بعد رزلٹ آیا۔ عابد بے دلی سے اسکول گیا، مگر کلاس میں پہنچتے ہی اس کے دوست توصیف نے جب اس یہ خبر دی کہ وہ فرسٹ آیا ہے تو پہلے تو اسے یقین نہ آیا، مگر جب دوسرے دوستوں نے بھی اسے مبارک باد دی تو اسے یقین کرنا پڑا۔ عابد نے دیکھا کہ عباد سر جھکائے شرمندگی سے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنی تعلیم پر غرور کیا اور یہ سوچا کہ عابد مجھ سے آگے کبھی نہیں نکل سکتا، لیکن آج وہ مجھے شکست دے چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسے بالکل ہی صفر سمجھا تھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور عابد کی طرف بڑھا۔ دوسری جانب عابد بھی عباد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت عابد کے کیا احساسات ہیں، اس لیے اس نے اپنی طرف آتے عباد کا ہاتھ تھاما اور اسے گلے لگا لیا۔ اسے اپنے پیارے دوست پر فخر تھا۔ n

میرے نانا

ایک غازی

شبانہ کوثر۔ کراچی

تمام بچے حلقہ بنائے نانا جان کے گرد جمع تھے۔ میں بھی ان میں جا کر بیٹھ گئی۔ نانا جان 1965ء کی جنگ میں پیش آنے والے واقعات بڑے پر جوش انداز میں سنا رہے تھے۔ میرے نانا جان محمد گلزار خان نے ایک فوجی کی حیثیت سے جنگ ستمبر میں حصہ لیا تھا اور غازی کہلائے۔ بعد میں انہیں "تمغہ برائے حسن کارکردگی" سے بھی نوازا گیا۔ وہ اپنی کہانی سنا رہے تھے:

جب 1965ء کی جنگ میں دشمن نے اچانک رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھپ کر پیارے پاکستان پر حملہ کیا تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ صبح کا ناشتا لاہور میں کریں گے، مگر اس موقع پر ہماری بہادر فوج نے جس جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا، اس کی وجہ سے دشمن کو الٹے پاؤں بھاگتے ہی بنی۔ ہمارے فوجیوں نے انتہائی بہادری و دلیری سے دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ حالاں کہ دشمن کی تعداد ہم سے کئی گنا زیادہ تھی اور اسلحہ کے لحاظ سے بھی دشمن کو ہم پر برتری حاصل تھی۔ مگر یہ اللہ جل شانہ کی مدد اور پاکستانی عوام کی دعائیں تھیں جنھوں نے بہادر نوجوانوں کو حوصلہ دیا اور انہوں نے اس حملے کا منہ توڑ جواب دیا اور پاک سرزمین کا دفاع بھرپور طریقے سے کیا۔ اس جنگ کے دوران قربانی کی لازوال داستانیں رقم کی گئیں جن کی پوری دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ ہمارے یہ فوجی جوان آج بھی اپنی سرحدوں کا دفاع کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔

نانا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر ان کی آواز میں بڑا عزم تھا۔ وہ پھر کہنے لگے کہ ہمیں اپنے ان بہادر فوجیوں پر فخر ہے۔

نانا جان تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے، مگر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں جب بھی افواج پاکستان کی دلیری و جرأت مندی کی کہانیاں سنتی ہوں تو میرے دل اور میری زبان سے یہ دعا نکلتی ہے: "پاک فوج سلامت رہے"

ننھی پیلی پتنگ



گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر میں تو خوب گرمی تھی مگر شام ہوتے ہی سہانی ہوا چلنے لگی...... اب ایسے موسم میں ننھے منے ارحم کا دل پتنگ اڑانے کے لئے نہ مچلتا، یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ بھاگا بھاگا اپنے کمرے میں پہنچا اور پلنگ کے نیچے رکھی اپنی پتنگ کو ہاتھوں میں تھام کر باہر کی جانب دوڑ پڑا۔ سرسبز وادی کا ہر پھول نرم ہوا میں گنگناتا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر آ کر وہ کسی اونچے ٹیلے کی جانب بڑھنے لگا، تاکہ اونچائی پر تیز ہوا کے سنگ پتنگ بھی آسمان سے باتیں کرے۔ اب ایک طرف تو ارحم اپنی پیلی پتنگ کے سنگ بے حد خوش تھا، مگر دوسری طرف جیسے ہی اس نے پتنگ ہوا میں اڑانے کی کوشش کی، اسے پتہ چل گیا کہ اس کے پاس موجود دھاگہ اتنا بڑا نہیں کہ پتنگ بلندی تک پہنچ پائے، ارحم میاں تو دھاگے کی لمبائی کم ہونے پر بھی صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے، البتہ پیلی پتنگ، ارحم کے ہاتھوں سے نکل کر، آسمان سے باتیں کرنے کو بیقرار تھی اور اپنی ہی زبان میں چیخ چیخ کر ارحم کو ڈھیل دینے کے لئے، ”مجھے اڑنے دو، ارحم...... مجھے اور اوپر جانے دو، دیکھو تو ذرا ہوا کتنی تیز ہے، مجھے اور اوپر جانا ہے“ کہہ رہی تھی۔ مگر ارحم کیسے اپنی پتنگ کو اوپر جانے دیتا، اس کی پتنگ کا دھاگہ ختم ہو چکا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوا کا جھونکا آیا، اور ارحم کی پتنگ لے اڑا، اپنی پتنگ کو آسمان میں گم ہوتے دیکھ کر ارحم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ہاتھ میں ٹوٹا ہوا دھاگہ تھامے، روتے ہوئے گھر واپس آ گیا۔

ارحم اپنی پتنگ کی جدائی پر آہیں بھر رہا تھا، اور وہاں آسمان میں آزادی سے اڑتے ہوئے، ارحم کے دکھ کی پروا کئے بغیر پیلی پتنگ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو خوشی سے گنگنا رہی تھی، ”اب میں کسی کی غلام نہیں، بلکہ آزاد ہوں اور پورا آسمان میرا گھر بن چکا ہے۔ میں جہاں چاہے جا سکتی ہوں، بلکہ میں تو چاند تک پہنچ سکتی ہوں۔ ننھا ارحم اچھا تو تھا مگر اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ پتنگ اڑاتے کیسے ہیں۔“ مگر پیلی پتنگ کی یہ خوشی اور سرشاری تھوڑی دیر میں ہی ہوا کے ساتھ ماند پڑ گئی، جیسے ہی ہوا کا زور ٹوٹا، پتنگ تیزی سے زمین کی جانب گرنے لگی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا، جس میں بطخیں نہانے میں مصروف تھیں۔ اچانک جو یہ پتنگ تالاب میں گری بطخیں خوفزدہ ہو گئیں اور تالاب سے باہر کی جانب دوڑ پڑیں۔

پیلی پتنگ جو تھوڑی دیر پہلے اپنی آزادی پر خوش ہو رہی تھی، اور جسے ارحم سے جدائی کا کوئی غم بھی نہیں تھا، اب بے اختیار دعا کرنے لگی، ”ارحم تم کہاں ہو؟ میں اڑنا چاہتی ہوں، مگر اب ڈوب رہی ہوں...... کاش کہ تم مجھے بچانے آ جاؤ۔“

اب کیا ہو سکتا تھا، ارحم تو اسے بچانے نہ آیا، مگر ایک بلی نے اسے دیکھ لیا اور اسے اپنے منہ میں دبا کر ساحل پر لے آئی، کچھ دیر تو بلی اس پیلی عجیب و غریب چیز کے ساتھ کھیلتی رہی اور پھر اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اب جو پتنگ نے اپنی حالت پر نظر ڈالی تو خود پر دو تین سوراخ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اپنی قسمت پر یوں ہی آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک تیز ہوا کا جھونکا اسے لے اڑا، آسمان میں بلند ہوتے ہی پتنگ ایک بار پھر چاند پر پہنچنے کی آرزو کرنے لگی۔

ان سہانے سپنوں کا انجام بھی کچھ خاص اچھا نہ ہو سکا، کیونکہ جیسے ہی ہوا کا زور ٹوٹا پتنگ ایک بار پھر تیزی سے زمین کی جانب آنے لگی، اور اس وقت تو جیسے چاند تک پہنچ پانے کی ساری امید ہی دم توڑ گئی، جب نیچے آگ کے الاؤ نے پیلی پتنگ کی دم جلا دی، وہ تو بھلا ہو، ٹھنڈی ہوا کا جس نے پوری پتنگ میں آگ لگنے سے پہلے پہلے پتنگ کو ایک بار پھر اڑان نصیب کر دی۔ اب تو پیلی پتنگ نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا، ”اب میں کیسے اڑ سکوں گی؟ میری تو دم ہی جل گئی ہے...... دم کے بغیر میں اڑوں گی کیسے؟“ اب بھی پتنگ کہیں گر جاتی اور کبھی تیز ہوا اسے ادھر سے ادھر اڑاتی پھرتی...... پتنگ کو اپنا معصوم دوست ارحم ہر پل یاد آتا اور وہ سوچتی، ”جانے کیوں میں نے اپنے اتنے پیارے دوست کا ساتھ چھوڑ دیا، کاش میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی، اپنے دوست کے ساتھ ایک دھاگے میں بندھے رہنا کتنا انمول بندھن تھا، کم از کم میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے تو بچ جاتی۔“

ابھی وہ انہی سوچوں میں ڈوبی تھی کہ ایک بار پھر ہوا اسے لے اڑی، اور اب کی بار وہ جہاں گری وہاں ایک گدھا تو پہلے سے ہی اسے کھانے کو بے تاب بیٹھا تھا۔ جیسے جیسے گدھا اس کے قریب آ رہا تھا، ویسے ویسے پیلی پتنگ کی منمناہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور اب تو وہ باقاعدہ چیخ رہی تھی۔ ”دیکھو میرے قریب مت آؤ، مجھے کھانا نہیں، میں تمہارا کھانا نہیں ہوں، رکو...... دور ہٹو مجھ سے۔“

مگر کیا کبھی کسی گدھے نے کسی پتنگ کی بات سنی ہے جو یہ سنتا، ایک گدھے کی دیکھا دیکھی کھیت میں موجود دوسرے گدھے بھی پتنگ کے ارد گرد جمع ہونے لگے، کچھ ہی دیر میں یوں ہوتا کہ سارے گدھے مل کر پتنگ کو چیر پھاڑ دیتے مگر اتنے میں کسان کا بیٹا وہاں پہنچ گیا...... اور سارے گدھوں کو ہٹا کر پتنگ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ”واہ...... کتنی خوبصورت پیلی پتنگ ہے، یہ مجھے ملی ہے اور اب میری ہے...... میں اس کی اچھی طرح مرمت کروں گا، اور اگر میں اس کی ایک اچھی سی دم بنا دوں تو یہ آسانی سے اڑ بھی سکے گی۔“

جب وہ اپنی پتنگ لے کر گھر پہنچا تو اس کی امی نے پتنگ کی مرمت کرنے میں اس کی مدد کی، سب سے پہلے انہوں نے پتنگ کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں پر کاغذ لگایا اور پھر کاغذ اور دھاگے سے پیلی پتنگ کی نئی دم بھی بنا دی۔ ویسے دیکھنے میں پتنگ کی دم پہلے کی طرح خوبصورت تو نہیں تھی۔ مگر یہ طے تھا کہ یہ نئی دم اسے اڑنے میں مدد دے گی۔

آج سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایسے موسم میں کسان کا چھوٹا بیٹا جو کہ اپنی نئی پتنگ اڑانے کو بیتاب تھا، اپنی پتنگ کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ”مجھے ٹیلے کے اوپر جا کر اپنی پتنگ اڑانی چاہیے۔“

تو بس یوں چھوٹے صاحب اپنی پتنگ اور محض 2 میٹر لمبے دھاگے کے ساتھ پتنگ اڑانے لگے...... لیکن کیا آپ کو پتہ ہے اس بار آسمان پر دور تک سیر نہ کر پانے کی وجہ سے پتنگ نے بالکل برا نہ مانا۔ اور نہ ہی آسمان تک پہنچنے کی خواہش میں پیلی پتنگ نے آگے کی جانب کھینچا تانی کی۔ بلکہ اب تو پتنگ اپنے نئے دوست کے ساتھ دھاگے میں بندھ کر بہت خوش تھی اور سوچ رہی تھی۔ ”کیا بات ہے، میں چاند تک نہیں پہنچ پا رہی مگر کم از کم اس دھاگے سے بندھ کر ایک دوست کے ساتھ محفوظ ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے اس ننھے دوست کے ساتھ رہوں گی، اور اپنے لئے خوشیاں ڈھونڈنے کے بجائے دوسروں کو خوش رکھوں گی۔ اسی طرح مجھے بھی خوشی ملے گی۔“

جی ہاں بچو! یہ تھی ایک نادان پتنگ کی اڑان کی داستان، جس نے اپنے دوست سے بچھڑ کر جانا کہ چاند تک پہنچنا ہی کامیابی نہیں بلکہ اصلی خوشی تو یہ ہے کہ آپ اپنے دوستوں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں۔ ویسے کیا آپ کو پتہ ہے، آج بھی کسان کے کھیت میں پیلی پتنگ اور اس کے ننھے دوست ساتھ کھیلتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ جو کیا ہے!

مصلحت

عروشہ بنت عمر حیات۔ ڈجکوٹ

حبیب اور معاذ بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ ساتھ اسکول جاتے، ساتھ کھیلتے اور ساتھ ہی ہوم ورک کرتے تھے، مگر آج گراونڈ میں کھیلتے ہوئے ان دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ غلطی سراسر حبیب کی تھی، مگر وہ مان نہیں رہا تھا اور معاذ کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔ معاذ نے اس کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے کی بہت کوشش کی، مگر حبیب نہ مانا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس طرح دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے۔

کچھ دن بعد ان کے پیپر شروع ہو گئے۔ پہلا پیپر میتھ کا تھا۔ پیپر شروع ہونے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ حبیب بڑی دیر سے اپنے بیگ میں سے اپنا جومیٹری بکس ڈھونڈ رہا تھا، مگر وہ نہیں مل رہا تھا۔ شاید گھر رہ گیا تھا۔ اب تو حبیب پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے دوستوں سے پوچھا مگر کسی کے پاس فالتو پین نہیں تھا۔ حبیب اپنی جگہ اداس بیٹھا تھا کہ معاذ اس کے پاس آیا اور اس کی طرف پین بڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر پریشان حال حبیب اس کے گلے لگ گیا۔ اس نے اپنی غلطی مان لی اور وہ دونوں پھر اچھے دوست بن گئے۔

حبیب نے گھر آکر اسکول میں پیش آنے والا واقعہ اپنی امی کو سنایا۔ امی نے اس کی بات سن کر کہا: ”اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت تھی۔ اگر تمہارا پین گم نہ ہوتا تو تمہیں معاذ اپنا پین نہ دیتا۔ نہ تمہیں معاذ کی سچی دوستی کا یقین آتا اور نہ ہی اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ پھر تو تمہاری معاذ سے صلح بھی نہ ہوتی۔“

یہ سنتے ہی حبیب نے سوالیہ انداز میں پوچھا: ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا پین اور جومیٹری باکس اس لیے گم ہوا تھا، تاکہ میری معاذ سے دوستی ہو جائے؟“

”جی بیٹے!“ امی نے پیار سے جواب دیا: ”اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔“ n

مجھے بہن سے ملنا ہے

آج توصیف وقت سے پہلے ہی اٹھ گیا اور سیدھا کچن میں کھڑی اپنی امی جان کے پاس پہنچا۔ اس نے ماں کو سلام کیا تو انہوں نے بھی پیار سے توصیف کا ماتھا چوم لیا۔ توصیف کی چھوٹی بہن عظمیٰ بھی بہت خوش تھی۔ دونوں بہن بھائی اپنے امی ابو کی جان تھے۔ وہ چوتھی کلاس میں پڑھتے تھے اور خوب محنت کرتے تھے۔

دونوں ایک ہی دن چھٹی کرتے تھے۔ آج دونوں بہن بھائی کا اسکول جانے کا موڈ نہیں تھا، اسی لیے وہ اپنی امی سے اسکول نہ جانے کی ضد کر رہے تھے۔

رات کو توصیف اور عظمیٰ نے مل کر اپنے گھر کو خوب سجایا تھا۔ گل دانوں، گملوں اور کیاریوں کی بھی صفائی کی تھی۔ آج پانچ سال بعد ان کے ماموں پاکستان آرہے تھے جو برطانیہ میں رہتے تھے۔ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت سردی کی چھٹیاں گزارنے آرہے تھے۔ ان کی امی انہیں اسکول جانے کو کہہ رہی تھیں لیکن دونوں اسکول جانے کو تیار نہیں تھے۔ امی انہیں سمجھا رہی تھیں کہ ماموں تو شام کو آئیں گے، جب کہ تم لوگ اسکول سے دوپہر کو واپس آجاؤ گے۔ ایسا ہی ہے تو اپنے ابو کے ساتھ مہمانوں کو لینے ایئرپورٹ چلے جانا۔

یہ سن کر توصیف اور عظمیٰ نے اسکول بیگ اٹھائے اور چل دیے، مگر چلتے چلتے دونوں رکے اور اپنی امی سے کہا:

"امی جی! اسکول جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔"

"نہیں بیٹا، آپ کی دو بجے چھٹی ہو جائے گی اور ماموں تو شام چھ بجے پہنچیں گے۔ خواہ مخواہ وقت خراب نہ کریں۔ جاؤ شاباش!" امی جان نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور انہیں دعا دی: "اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔"

☆☆☆

توصیف اور عظمیٰ کے جانے کے بعد ان کی امی مصروف ہو گئیں، تھوڑی دیر بعد ان کی نظر ٹی وی پر پڑی تو ان کا سانس رکنے لگا۔ بریکنگ نیوز چل رہی تھی:

پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر دہشت گردوں کا حملہ... سو سے زائد بچے شہید

یہ سنتے ہی وہ بری طرح رونے لگیں۔ پھر اٹھیں اور اسکول کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اسکول کے اندر و باہر موت کا سماں تھا۔ ہر طرف خوف و دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ زخمی بچوں کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا اور شہید بچے.... وہ کچھ نہ دیکھ سکیں اور بلک بلک کر رونے لگیں۔ پھر انہوں نے پکارنا شروع کر دیا: "میرے ... توصیف... عظمیٰ... کہاں ہو... توصیف... عظمیٰ... دیکھو میں تمہیں لینے آئی ہوں"

ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ پھر ان کے سامنے توصیف کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا گیا تو وہ زبردستی ایمبولینس میں سوار ہو گئیں۔ اسپتال میں بھی چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ سبھی والدین بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد انہیں توصیف سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ اپنے بیٹے کو اس حالت میں دیکھ وہ ایک بار پھر رو دیں۔

توصیف لڑکھڑاتی زبان میں بار بار کہہ رہا تھا: "عظ.... می.... ک.... کہاں.... ہے...."

اس کی بات سن کر امی بلک بلک کر رونے لگیں۔ توصیف نے بڑی مشکل سے کہا:

..."بڑے بڑے بالوں والے انکل آئے ان... کے پاس بندوقیں تھیں... انہوں نے ہم سب پر گولیاں چلائیں میں بھاگ کر ڈیسک کے نیچے چھپ گیا اور عظمیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی نیچے کھینچ لیا... پھر ہمیں نیچے سے نکال کر بہت مارا میں... بے ہوش ہو گیا... عظمیٰ کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا تھا... مجھے عظمیٰ سے ملنا ہے..." یہ کہتے کہتے توصیف اللہ کو پیارا ہو گیا۔n

نابینا مہمانِ خصوصی

وقاص اسلم کمبوہ، بارہ میل

بازار کی چہل پہل آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ دکان دار، ٹھیلے والے اور ریڑھی والے سب آہستہ آہستہ اپنے کام شروع کر رہے تھے۔ سبزی اور پھلوں والوں نے آوازیں لگانا شروع کر دی تھیں۔

گلو بھی اپنی خستہ حال ریڑھی لیے چوک میں ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس جگہ کوئی دوسرا ریڑھی نہیں لگاتا تھا۔ باقی سب ریڑھی والوں کی طرح وہ بھی آوازیں لگا رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی سبزیاں ور پھل بھی ترتیب دے رہا تھا۔

گلو قریبی محلے میں رہتا تھا۔ وہ دو بچوں کا باپ تھا اور صبح سے شام تک ریڑھی پر سبزیاں اور پھل بیچتا، لیکن وہ اس محنت والے کام سے ہمیشہ تنگ رہتا تھا۔ اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری کرتا تھا۔ اللہ سے اپنی غربت کا شکوہ کرتا رہتا تھا۔ اکثر گھر میں اسی بات پر گلو کی اپنی بیوی سے بحث بھی ہوتی تھی۔

”میں صبح سے شام تک کڑی دھوپ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگاتا ہوں تو تھوڑی سی بچت ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو دیکھو، آرام سے سارا دن کرسی پر ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کام کرتے اور لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ ہمیں کیوں اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟ ہم کیوں اپنا خون جلاتے ہیں؟ اللہ نے ہمیں غریب کیوں پیدا کیا ہے؟“

غرض وہ اپنی بیوی کے سامنے شکوے شکایت کرتا تو بیوی اسے سمجھاتی:

”ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری مت کرو۔“

لیکن گلو کے کان پر جوں تک نہ رینگتی، بلکہ وہ بیوی کی بات سن کر اور زیادہ طیش میں آجاتا۔ اس طرح اس کا گھر کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔

☆☆☆

اس روز شہر کے مرکزی گراؤنڈ میں جلسے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ خوب صورت شامیانوں میں سینکڑوں کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ پورا میدان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ اب سب کو مہمانِ خصوصی کی آمد کا انتظار تھا جو اس علاقے کے نئے منتخب ایم این اے۔ لوگوں کو ان سے بڑی امیدیں تھیں، اسی لیے ان کے اعزاز میں اس جلسے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جلسہ گاہ پہنچے تو لوگوں نے خوب تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ کلف لگے سوٹ میں ملبوس کالا چشمہ لگائے وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلے۔ وہ نابینا تھے، اس لیے کسی کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ ایک جوان کی مدد سے اسٹیج پر پہنچے تو انھیں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ جب وہ تقریر کرنے مائیک کے سامنے پہنچے تو ان کے نام کا ایک زوردار نعرہ لگایا گیا۔ نعرے کی آواز اتنی بلند تھی کہ گلو کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہانپتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی۔ اس نے یہ عجیب سا خواب دیکھا تھا جس میں وہی نابینا مہمان خصوصی تھا، یعنی غلام حیدر عرف گلو۔ اس نے جلدی سے اپنے رب سے معافی مانگی اور اس کا شکر ادا کیا جس نے اسے صحت مند اور تن درست پیدا رکھا تھا۔ اب اسے احساس ہو گیا تھا کہ اصل غریب وہ نہیں جس کے پاس دولت نہیں، بلکہ اصل غریب وہ ہے جو اتنی دولت رکھنے کے باوجود جسمانی اور روحانی نعمتوں سے محروم ہے۔ اس نے اللہ کے حضور دو رکعت نماز نفل ادا کی اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی جو وہ اللہ پاک کی ناشکری کرتا تھا۔ چند روز میں ہی غلام حیدر عرف گلو ایک شاکر اور محنتی انسان بن گیا۔n

ندامت کے آنسو

نرگس عامر۔ کورنگی

اکراش کو ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس وقت بھی وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ عصر کی اذان ہونے والی تھی، لیکن اکراش ٹی وی میں لگا ہوا تھا۔ ویسے بھی اسے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ کون سی اذان کب ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد پوری فضا اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجنے لگی، مگر اکراش کو اب بھی ہوش نہ تھا۔

اس کی امی کچن میں تھیں۔ وہ وہیں سے غصے میں بولیں: ”یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اذان ہو رہی ہے اور تم نے ٹی وی کی آواز بند نہیں کی!“

اکراش نے جلدی سے کہا: ”امی! اتنے اچھے کارٹون آ رہے ہیں اور اذان تو اب ختم ہونے......“ اس سے پہلے کہ اکراش اپنی بات مکمل کرتا، اس کی امی نے آگے بڑھ کر ٹی وی آف کر دیا۔

پھر انھوں نے اکراش سے کہا: ”بیٹا! اذان کے وقت سب کچھ چھوڑ کر صرف اذان کا جواب دیتے ہیں۔ تمھیں بھی اذان کا احترام کرنا چاہیے۔“

یہ کہہ کر امی وضو کرنے چلی گئیں۔ جب اکراش نے دیکھا کہ امی نماز پڑھنے جا چکی ہیں تو اس نے پھر ٹی وی آن کر لیا، لیکن اب تک کارٹون ختم ہو چکے تھے۔ وہ چینل بدلنے لگا، اتفاق سے ایک اسلامی چینل لگ گیا جہاں ایک مولانا دین کی اچھی باتیں بتا رہے تھے۔ اکراش نے چینل بدلنے کے لیے بٹن دبانا چاہا تو ریموٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا، وہ جھک کر ریموٹ اٹھانے لگا تو اس کے کانوں میں مولانا کی آواز پڑی اور پھر وہ سنتا ہی چلا گیا۔ مولانا دینی اور اخلاقی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا انداز اتنا دل کش تھا کہ اکراش چاہتے ہوئے بھی چینل نہ بدل سکا۔ وہ کہہ رہے تھے:

”ہمارے آج کے بچوں کو مسلمان ہونے کے باوجود دین کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ انھیں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹی وی پر کون سا پروگرام کس وقت آئے گا، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون سی اذان کس وقت ہوتی ہے۔ قرآن میں اللہ اپنے بندوں سے کیا فرماتا ہے۔ انھیں اداکاروں کے نام تو یاد ہوتے ہیں، لیکن پیغمبروں اور صحابیوں کے نام یاد نہیں ہوتے۔ آج کے لوگ نماز پڑھنا تو درکنار وہ اذان کا احترام تک نہیں کرتے، اسی لیے آج مسلمان اتنی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔“

اکراش نے جب یہ باتیں سنیں تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ آنسو خوف کے بھی تھے اور ندامت کے بھی۔ اس نے فوراً توبہ کی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے بروقت سیدھا راستہ دکھایا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور وضو کر کے مسجد کی جانب چل دیا۔ n

نئی سوچ

تصور عباس سہو

وہ دسمبر کی آخری شام تھی۔ میں بس میں بیٹھا اپنے گھر آرہا تھا۔ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا اور وہاں تک جانے کا راستہ خاصا لمبا تھا۔ شام کا اندھیرا چھاتے ہی گاؤں جانے والی سڑک سنسان ہو جاتی تھی۔ میں کسی کام سے ساہیوال گیا تھا، اس لیے دیر ہو گئی تھی۔ اب پریشان ہو رہا تھا کہ گھر کیسے جاؤں۔

پھر مجھے اپنا دوست مدنی یاد آیا۔ میں نے اسے ایس ایم ایس کیا کہ میں لیٹ ہوں، مجھے گھر تک چھوڑ دینا۔ اس نے اوکے کا جواب بھیج دیا۔

آٹھ بجے میں اپنے اسٹاپ پہ پہنچ گیا۔ سردیوں میں دن ویسے ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ میں نے مدنی کو ایس ایم ایس کیا کہ میں پہنچ گیا ہوں، مگر اس کا جواب آیا: ”سوری بھئی، سردی بہت ہے۔“

اس کا ایس ایم ایس پڑھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں نے اسے دوبارہ ایس ایم ایس کیا، مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ سخت سردی، اندھیرا اور ہر طرف چھائی ہوئی دھند اور سناٹا، میری حالت خراب ہونے لگی۔ اب میں اپنے ابو کے دوست کے میڈیکل اسٹور کی طرف اس امید پر چل دیا کہ شاید وہاں سے کوئی مدد مل جائے۔ وہاں عامر اور عمیر تو تھے، مگر انہیں بخار تھا، اس لیے انہوں نے معذرت کر لی۔ میں واپس چلا تو ایک موبائل شاپ کے باہر حمید اور قاسم کھڑے دکھائی دیے۔ وہ میرے دشمن تھے اور دو سال پہلے میرے ساتھ برا سلوک کر چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔

قاسم نے کہا: ”خیریت تو ہے؟ اس وقت یہاں کیسے؟“

میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو قاسم بولا: ”پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ہم تمہیں چھوڑ آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر قاسم نے بائیک کی چابی حمید کو پکڑائی اور کہا: ”اسے چھوڑ آؤ۔“

بیس منٹ بعد میں گھر میں تھا اور حمید واپس جا چکا تھا، لیکن اس چھوٹے سے واقعے نے میری سوچ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے جو نفرت تھی، وہ ختم ہو چکی تھی۔ اب میرے دل میں محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ میری سوچ بھی بدل چکی تھی۔ اب میرا دل صاف اور شفاف ہے۔ ■

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

جنگ بدر



دشمن......کفار مکہ کفار کے لشکر کا سپہ سالار......عتبہ بن ربیعہ مسلمان فوج کے سپہ سالار...... نبی کریمؐ ...... 2 ہجر یجنگ بدر کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان پہلی لڑائی تھی اور تاریخ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک طرح سے فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اور اگر خدانخواستہ اس میں مسلمان ناکام رہتے تو نہ معلوم کیا واقعات پیش آتے۔ اس لڑائی سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ صرف کثرت فوج وسپاہ اور زر و مال پر فخر غلط ہے بلکہ فتح ونصرت کے لیے ایمان، یقین محکم اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ضروری چیزیں ہیں۔

آغاز اسلام ہی سے کفار مکہ حضور نبی کریمؐ اور ان چند لوگوں سے جو اس وقت مسلمان ہو گئے تھے بغض وعناد پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ انہیں ہر ممکن طریقہ سے تنگ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں خود پیغمبر خداؐ کی ذات مبارک کو جو ایذائیں دیں اور مٹھی بھر مسلمانوں پر جو جو مظالم کئے ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جب کچھ مسلمان تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے تو کفار نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر ان تمام مظالم، تکلیفوں اور مخالفتوں کے باوجود خدا کا سچا دین اسلام ترقی ہی کرتا گیا اور دن بدن اسے تقویت ہی حاصل ہوتی گئی۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے باوجود مکہ میں مسلمانوں کی زندگی دوبھر ہوگئی اور اللہ کے حکم سے حضورؐ کو مدینہ ہجرت کرنا پڑی۔

مدینہ پہنچ کر مسلمانوں نے اطمینان وچین کا سانس لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں گرد و نواح میں بھی ان کا اثر ورسوخ پھیل گیا۔ حضورؐ نے غیر مسلموں سے بڑے منصفانہ معاہدے کئے تاکہ کسی قسم کا فتنہ وفساد برپا نہ ہو سکے۔ کفار مکہ بھلا اسے کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ دنیا سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ مسلمان مزید قوت حاصل کر لیں، مدینہ پر حملہ کر کے انہیں نیست ونابود کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ چال چلی گئی کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو جو اوس اور خزرج میں ہنوز بت پرست تھے کہا:۔

''تم نے ہمارے دشمن کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا ہے۔ اب لازم ہے کہ تم اس سے لڑو یا وہاں سے نکال دو۔ ورنہ ہم نے قسم کھالی ہے کہ ہم ایک بارگی تم پر حملہ کر دیں گے۔ تمہارے نوجوانوں کو قتل کر ڈالیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے۔''

یہ پیغام آیا تو عبداللہ بن ابی نے فیصلہ کر لیا کہ اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا۔ حضور نبی کریمؐ کو بھی اس امر کی اطلاع ہوگئی۔ حضورؐ خود اس اجتماع میں تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر فرمایا:

''قریش نے تم سے ایسی چال کھیلی ہے کہ اگر تم ان کی دھمکی میں آ گئے تو تمہارا بہت زیادہ نقصان ہوگا۔ بہ نسبت اس کے کہ تم ان کی بات ماننے سے انکار کر دو گے۔ کیونکہ اگر تم مسلمانوں سے لڑو گے تو اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی بھائیوں اور فرزندوں کو (جو مسلمان ہو چکے ہیں) قتل کرو گے۔ اگر تمہیں قریش سے لڑنا پڑا تو وہ غیروں سے مقابلہ ہوگا۔''

یہ مختصر سی تقریر بڑی دلنشین اور مؤثر ثابت ہوئی۔ اور عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی اس ارادے سے باز آ گئے۔

جب کفار کو اس تجویز میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے یہودیوں سے ساز باز شروع کر دی۔ ان میں سے بہت سوں کو انہوں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی تھی جو یہودیوں نے مسلمانوں سے کیا تھا۔ اس کی سزا انہیں آگے چل کر ملی۔ پھر چند روز کے بعد کفار نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں چیلنج دیا کہ:

''تم مغرور نہ ہو جانا کہ مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے۔ مدینہ میں پہنچ کر تمہارا ستیاناس کر دیں گے۔''

اس کے بعد انہوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر بہت سے مویشی ہانک کر لے گئے۔ وہ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ کس قدر قوت وطاقت کے مالک ہیں بلکہ لڑنے کے لئے کوئی بہانہ ہی چاہتے تھے۔

جب مسلمانوں کی طرف سے کوئی قدم نہ اٹھا تو انہوں نے ایک اور پروپیگنڈا شروع کیا۔ اتفاق سے کفار کا ایک قافلہ شام سے مال تجارت لے کر مکہ واپس آ رہا تھا۔ ابوجہل نے مشہور کر دیا کہ مسلمان یہ قافلہ لوٹنے والے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سب لوگ جن کا مال تجارت میں لگا ہوا ہے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، کفار قافلہ کی حفاظت کے بہانہ مکہ سے نکلے اور مدینہ کا رخ کیا۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے ان کے ساتھ تھے اور وہ پوری طرح مسلح تھے اس کے علاوہ بڑا ساز وسامان بھی تھا۔ گانے والی لڑکیاں اور آلات جنگ بھی تھے۔

راستہ ہی میں انہیں خبر ملی کہ جس قافلہ کی حفاظت کے لئے وہ مکہ سے نکلے تھے وہ بخیریت پہنچ گیا ہے۔ سالار قافلہ ابوسفیان نے کہلا بھیجا کہ اب انہیں واپس آ جانا چاہئے۔ مگر ابوجہل نے دوسرے سرداروں کو مشورہ دیا کہ اب ہمیں بدر سے ادھر واپس نہیں آنا چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ وہاں تین روز ٹھہریں۔ اونٹ ذبح کریں، کھائیں کھلائیں، موج مستی کریں اور راگ گائیں۔ اس طرح قبائل عرب کے اطراف میں ہماری عظمت وشوکت کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ اور وہ ہمیشہ ہم سے ڈرتے رہیں گے۔

چنانچہ ابوجہل کا مشورہ قبول کیا گیا۔ اور یہ ایک ہزار جنگجو بدر کی طرف بڑھنے لگے۔

جب مدینہ میں کفار کے اس جارحانہ اقدام کی خبر پہنچی تو حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ مہاجرین نے قابل اطمینان جواب دیا۔ حضورؐ نے دوسری دفعہ پوچھا۔ مہاجرین کی طرف سے پھر قابل اطمینان جواب ملا۔ حضورؐ نے تیسری مرتبہ دریافت کیا۔ انصار اب سمجھے کہ حضورؐ ان کے جواب کے منتظر ہیں۔

اس پر انصار کی طرف سے حضرت سعدؓ بن معاذ کھڑے ہوئے کہا:

''شاید حضورؐ نے یہ خیال فرمایا ہے کہ انصار اپنے شہر سے باہر نکل حضورؐ کی اعانت کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ انصار کی طرف سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہم تو ہر حالت میں حضورؐ کے ساتھ ہیں۔ کسی سے معاہدہ فرمایئے، کسی معاہدہ کو نامنظور کیجئے۔ ہمارے زر و مال سے جس قدر منشاء مبارک ہو لیجئے، ہم کو جو مرضیٔ مبارک ہو عطا کیجئے۔ مال کا جو حصہ حضورؐ ہم سے لے لیں گے ہمیں وہ زیادہ پسند ہوگا، اس مال سے جو حضورؐ ہمارے پاس چھوڑ دیں گے۔ ہم کو حضورؐ جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ اگر حضورؐ عمران کے چشمہ تک چلیں گے تو ہم ساتھ ہوں گے۔ اگر حضورؐ ہم کو سمندر میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو حضورؐ کے ساتھ وہاں ہی چلیں گے۔ یا رسول اللہ ہم وہ نہیں کہ قوم موسیٰ کی طرح جا تو اور تیرا خدا دونوں لڑو، ہم تو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، کہہ دیں۔ ہم تو حضورؐ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے جنگ کے لئے حاضر ہیں۔'' (جاری ہے)

☆☆☆☆☆



پندرہ دن اتنی تیزی سے گزرے کہ پتا ہی نہ چلا۔

اب شہر سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ جامی کی امی نے ایک خوبصورت بیگ نیمو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اس کے اندر تم دونوں کے لیے تحفے ہیں۔ بیگ طرح طرح کے کھلونوں اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر جامی کے ابو سب کو اپنی کار میں بٹھا کر ان پہاڑیوں کے پاس لے گئے، جن کی دوسری طرف نیمو کیمو کا جنگل تھا۔

سب کار سے نیچے اترے تو نیمو نے کہا۔ ''بہت شکریہ۔ آپ لوگوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔'' پھر اس نے جامی اور پنکی کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم تم دونوں کو تو کبھی نہیں بھول سکتے۔ تم نہ ملتے تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا...... ''موقع ملے تو ہمارے جنگل میں آنا، ہم تمہیں اپنے سب دوستوں سے ملوائیں گے اور اچھی اچھی چیزیں دکھائیں گے۔'' کیمو نے کہا۔ ''اچھا، پیارے دوستو، اجازت دو، اب ہم چلتے ہیں......''

''رکو......'' جامی نے کہا۔ ''یہ تحفہ میری اور پنکی کی طرف سے ہے۔'' اس نے کیمو کے ہاتھ میں ایک فوٹو البم اور ایک چھوٹی سی آری تھماتے ہوئے کہا۔ آری بھائی کھٹ بڑھئی کے لیے تھی۔ نیمو کیمو نے البم کا پہلا صفحہ پلٹا اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ یہ وہی تصویر تھی، جس میں فن لینڈ آنے والے بچے نیمو کیمو کے منہ میں طرح طرح کی چیزیں ٹھونس رہے تھے اور ان کے پیٹ غبارے کی طرح پھولتے جا رہے تھے...... امی، ابو، پنکی، جامی اور نیمو کیمو زور زور سے ہنس رہے تھے اور ان کی آوازیں پہاڑیوں سے ٹکرا کر فضا میں گونج رہی تھیں۔ ''اس البم میں بہت ساری تصویریں ہیں۔'' پنکی نے کہا۔ ''اور ہر تصویر میں تم دونوں نظر آ رہے ہو...... ہمارے گھر میں...... اسکول میں...... چڑیا گھر میں...... سمندر کے کنارے...... بازاروں اور پارکوں میں......''

کیمو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں معلوم نہیں تھا کہ شہر میں تم جیسے اچھے اور پیارے لوگ رہتے ہیں۔ ہم جنگل کے سب جانوروں کو اس البم کی تصویریں دکھائیں گے، جب وہ تمہاری تصویریں دیکھ رہے ہوں گے تو ہم انہیں بتائیں گے کہ یہ دونوں دنیا کے سب سے خوبصورت اور سب سے نیک دل بچے ہیں......'' دونوں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ جب تک وہ نظر آتے رہے، جامی، پنکی اور ان کے ابو ان کی طرف دیکھتے رہے۔ بلندی پر پہنچ کر دونوں نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور فضا میں اپنے ہاتھ لہرائے۔ نیچے جامی اور پنکی نے بھی زور زور سے اپنا ہاتھ لہرایا۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئے تو اس کے ابو دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف بڑھنے لگے۔

☆☆☆☆☆



گاڈزیلا ہوٹل

پہاڑوں سے دوڑتی ہوئی عظیم الجثہ بلا جب آبادیوں کو کچلتی ہوئی چلی جاتی ہے تو اس خوفناک مانسٹر کو دیکھ کر فلم بینوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن جاپان نے سیاحتی تفریح مہیا کرنے کے لیے گاڈزیلا طرز کا ہوٹل قائم کیا ہے۔ 24 اپریل کو شن جوکو میں واقع Hotel Gracery Shinjuku کا افتتاح کیا ہے۔ یہ تیس منزل ہوٹل Toho سینما پر واقع ہے۔ اس میں گاڈزیلا تھیم کے بہت سے چیمبر تعمیر کیے گئے ہیں۔ Toho سینما کی چھت پر 12 میٹر بلند گاڈزیلا کا دیوہیکل سر شنجوکو کی گلیوں میں جھنکتا ہوا آنے جانے والوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ اسی طرح ہوٹل کے چھ کمروں سے اس کا نظارہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہوٹل میں گاڈزیلا روم بھی بنائے گئے ہیں۔ جنہیں قد آدم گاڈزیلا کے مجسموں سے سجایا گیا ہے۔ کچھ بیڈروم کی دیواروں کو اس کے پنجوں کلاسیکل مووی پوسٹر حتیٰ کہ ٹوائلٹ بھی گاڈزیلا تھیم کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیے گئے ہیں۔ ٹوہو سینما کی چھت پر واقع گاڈزیلا کا سر 2020ء کے اولمپک کی حکمت عملی کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ ہوٹل کے ترجمان ایگویوڈا کا کہنا ہے کہ دیوہیکل گاڈزیلا سیاحوں کی توجہ مرکوز کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔ شنجوکو کے مشیر کینیچی یوشی زومی کا کہنا ہے کہ اس شہر میں گاڈزیلا کی موجودگی نے تہلکہ مچادیا ہے۔ 1954ء میں Ishiro Honda فلم گاڈزیلا میں تخلیق کیا جانے والا یہ کردار دنیا بھر میں مشہور ہوگیا اور اب تک 28 فلموں میں دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح 16 مئی 2014 کو امریکی فلم King of the monsters میں اسے دکھایا گیا ہے۔ دراصل تباہ کن گاڈزیلا نیوکلیئر ہتھیاروں کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تباہ کن بلا انسانیت کے لیے سب سے بڑے خطرے کی علامت ہے۔ شنجوکو کے میئر کینیچی کا کہنا ہے کہ "میں نے سنا ہے کہ گاڈزیلا جن شہروں کو تباہ کرتا ہے وہاں اس تباہی کے بعد خوش حالی آجاتی ہے۔ لہٰذا اگلی فلم میں اس بلا کا ہدف شنجوکو شہر ہوگا۔ گاڈزیلا کے مداح جوق در جوق اسے دیکھنے آرہے ہیں اور بہت سے افراد اس کا نظارہ کرنے کے لیے ہفتے کے مختلف دنوں میں 335 ڈالر ادا کرکے اس کے کمرے میں رہتے ہیں، جبکہ ویک اینڈ پر 400 ڈالر کرایہ ادا کرکے اس کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ کمرہ جس کی کھڑکی سے اس کا سر نظر آتا ہے اس کا کرایہ 125 ڈالر فی رات ہے۔

☆☆☆☆☆

دھوپ میں جائیں نظر بڑھائیں

گلیوں میدانوں میں کھیلنا، درختوں پر چڑھنا اور دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے بچپن کی سب سے بڑی تفریح ہوا کرتی تھی، لیکن اب بچوں کی اکثریت گھروں میں گھسی رہتی ہے۔ سورج کی روشنی سے محروم بند کمرے، ویڈیو گیمز، انٹرنیٹ، ٹیبلٹ، موبائل فونز اور ٹی وی نے انہیں مصنوعی روشنی کا قیدی بنالیا ہے۔ سورج کی روشنی سے دوری نوجوانوں کی اکثریت کی بینائی کو متاثر کررہی ہے۔ دراصل شہروں کے چھوٹے چھوٹے بند گھر سورج کی روشنی سے ویسے ہی محروم رہتے ہیں، جبکہ بچوں اور نوجوانوں کی بڑی تعداد اسکرین کے اس قدر دیوانے ہیں کہ اب وہ دن میں باہر کا رخ ہی کم کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اگر بچے 40 منٹ بھی سورج کی روشنی میں گزاریں تو ان کی بینائی پر اچھے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ چین میں ہر پانچ میں سے چار بچے بینائی کی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی دور کی نظر کی کمزوری کے باعث چین میں ٹرانسپیرنٹ کلاس روم کے تجربات کیے جارہے ہیں تاکہ بچے زیادہ سے زیادہ وقت قدرتی روشنی میں گزار سکیں۔ چینی سائنس دانوں کے مطابق اس عمل سے 23 فیصد بچوں کی دور کی نظر کی کمزوری میں کمی واقع ہوئی ہے کیونکہ ہر روز 40 منٹ اضافی انہیں قدرتی روشنی میں گزارنے کے لیے دیئے گئے۔ اس عمل سے نہ صرف ان کی آنکھوں بلکہ جسمانی تندرستی پر بھی مثبت اثرات دیکھنے میں آئے۔ آسٹریلیا اور اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ نے بھی اپنے تجربات کی روشنی میں انہی نتائج کا انکشاف کیا ہے۔ ماہر امراض چشم سرجن ڈیوڈ الامبے نے خبردار کیا ہے کہ برطانیہ میں بچوں کی بینائی کے بڑھتے ہوئے مسائل کے پیش نظر ضروری ہوگیا ہے کہ انہیں گھر سے باہر کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے انہیں زیادہ سے زیادہ آؤٹ ڈور گیمز کا حصہ بننے پر مجبور کیا جائے۔ ڈاکٹر الامبے کا کہنا ہے کہ اس ملک میں ہر پانچ میں سے دو بچے دور کی نظر کی کمزوری کا شکار ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شرح میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ 100 برس قبل کی جانے والی تحقیق سے یہ آشکار ہوا تھا کہ طویل وقت تک مسلسل مطالعے سے بینائی پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور کتاب بینی کی عادت دور کی نظر کو کمزور کرتی ہے اب یہی نتائج اسکرین پر ثابت ہوتے ہیں۔ مختلف تحقیقی مقالوں سے یہ واضح ہوا ہے کہ دن کی روشنی کی کمی بینائی اور جسمانی صحت کو متاثر کرتی ہے۔ بچوں کی دور کی نظر کی کمزوری میں بڑھتا ہوا اضافہ ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کررہا ہے کہ مطالعے کی کمی کے باوجود ان کی بینائی میں کمزوری کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس تحقیق کی بنیاد پر اب چین میں اسکول کے بچے شفاف شیشے کے باکس میں پڑھائی کرتے ہیں۔ یہ شیشے کی کلاس انہیں روشنی اور وٹامن دونوں فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر الامبے جو لندن میں فوکس کلینک چلاتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مغرب کی 40 فیصد آبادی دور کی نظر کی کمزوری میں مبتلا ہے۔ اس کے برعکس شکار کرنے والے معاشروں میں مثال کے طور پر Gabon میں کی جانے والی تحقیق کے مطابق بالغوں میں دور کی نظر کی کمزوری 5.0 فیصد ہے۔ چین میں بچوں پر کی جانے والی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سورج کی روشنی انہیں Myopic genes سے محفوظ رکھے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت دن کی روشنی میں گزارا جائے خواہ آدھا یا ڈیڑھ گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس عمل سے بینائی اور آنکھوں سے بینائی اور آنکھوں کے پٹھے بھی تندرست ہوتے ہیں کیونکہ اندھیرے یا کم روشنی کی عادی آنکھوں کے پٹھوں میں دھوپ میں کھچاؤ پیدا ہوتا ہے، جو ان کی لچک کے لیے ضروری ہے اور آنکھیں واضح روشنی میں دور تک دیکھ پاتی ہیں، جس سے دور کی بینائی پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے دھوپ آنکھوں کے لیے بھی اس قدر اہم ہے جتنی ہڈیوں کے لیے۔

☆☆☆☆☆

نقل چور سہیلی

ماہ وش طالب...... لاہور

مریم کا آج اپنے نئے اسکول میں پہلا دن تھا۔ اپنی صلح جو طبیعت کے باعث اس نے بہت جلد پوری کلاس کو اپنا دوست بنا لیا اور اس کی ذہانت کی وجہ سے اساتذہ بھی اسے پسند کرنے لگے، وہ ضرورت پڑنے پر کلاس کے ہر بچے کی مدد کرتی اور کوشش کرتی کہ کسی ساتھی طالب علم کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ دراصل اس کی ممانے ہی اسے سب کے ساتھ مل جل کر رہنے اور ضرورت کے وقت ہر کسی کی مدد کرنے کا سبق پڑھایا تھا۔ وہ اپنے بڑوں کی فرمانبردار تھی، اس لئے اپنے والدین کی بھی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ ایک ہفتے بعد کلاس میں ٹیسٹ شروع ہو گئے، مریم نے دل لگا کر ٹیسٹ کی تیاری کی، اگلے دن کلاس میں مقررہ وقت پر اپنی کاپی مس کے پاس جمع کروانے کے بعد ٹیچر نے مریم سے باقی بچوں کے ٹیسٹ جمع کرنے کو کہا، مگر فاطمہ جو مریم کی بیسٹ فرینڈ تھی، اس نے ٹیسٹ کاپی واپس کرنے کے بجائے اس سے درخواست کی کہ وہ ٹیسٹ حل کرنے میں اس کی مدد کرے کیونکہ فاطمہ نے آج کے ٹیسٹ کی تیاری نہیں کی تھی۔ مریم اس کی بات سن کر حیران ہوئی اور ایسا کرنے سے منع کیا تو فاطمہ ناراض ہو گئی۔ بریک کی گھنٹی بجنے لگی تو مس، مریم کو سب بچوں کی امتحانی کاپیاں جمع کر کے اسٹاف روم میں جمع کروانے کا کہہ کر کلاس سے باہر چلی گئیں۔ ساری کلاس خالی ہو گئی تھی، مریم نے سوچا کہ وہ آج اس کی مدد کرنے کے بعد فاطمہ کو سمجھائے گی اور آئندہ نقل میں اس کی مدد نہیں کرے گی، اس سے اگلے دن جب ٹیچر نے بچوں کے مارکس بتائے تو مریم نے ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے، جبکہ فاطمہ دوسرے نمبر پر تھی۔ مریم خوش تھی کہ اس نے اپنی دوست کی مدد کر کے اسے ناراض نہیں کیا تھا مگر وہ دل میں شرمندہ بھی تھی کہ اس نے اپنی مس کو دھوکہ دیا تھا اور پھر یہ معمول بن گیا کہ فاطمہ ہر بار خود سے ٹیسٹ یاد کرنے کے بجائے ہر بار مریم کی نقل کرتی۔ مریم کو یہ سب پسند نہیں تھا اور اس نے فاطمہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی، لیکن ہر بار فاطمہ ناراض ہو جاتی، ایسے میں مریم کا نرم دل اداس ہو جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دو بار جب کلاس میں ٹیچر کے پوچھے گئے سوالوں کا فاطمہ درست جواب نہ دے پائی تو ٹیچر کو حیرت بھی ہوئی اور شک بھی۔ کلاس کے بعد ٹیچر نے مریم کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ”آپ کلاس ٹیسٹ میں فاطمہ کی مدد کرتی ہیں؟“ تو مریم نے جھوٹ بولنے کی بجائے سچ بتا کر اپنی غلطی تسلیم کی اور ٹیچر سے معافی مانگی اور کہا کہ آئندہ وہ اپنی ٹیچر کو دھوکہ نہیں دے گی۔ اسکول سے واپسی پر مریم پرسکون تھی کہ سچ جان کر بھی اس کی ٹیچر نے اسے معاف کر دیا لیکن دل ہی دل میں وہ فاطمہ کے لئے فکرمند تھی کیونکہ وہ اس کی بہترین دوست تھی مگر فاطمہ، مریم کے صحیح مشورے پر کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی، محنت سے جی چراتی تھی اور مریم کی صلح جو طبیعت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مریم پر انحصار کرنے کو صحیح سمجھ رہی تھی، اس لیے اُسے مس کی مدد لینے کا فیصلہ صحیح لگا۔ اگلے دن ٹیچر نے فاطمہ سے کچھ بھی پوچھنے اور کہنے کے بجائے بس اسے مریم کے پاس سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھایا۔ مریم کے پاس سے اٹھتے ہوئے فاطمہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کیونکہ وہ پیپرز کی تیاری نہیں کر رہی تھی اور یہی سمجھتی رہی کہ ٹیچر کو کبھی پتہ نہیں چلے گا اور وہ نقل کر کے مریم جیسی لائق اسٹوڈنٹ بن جائے گی۔ جب رزلٹ آیا تو مریم نے حسب معمول اپنی محنت کے بل بوتے پر اول پوزیشن حاصل کی تھی اور فاطمہ تمام مضامین میں بری طرح فیل ہو گئی، کلاس کے سب بچوں نے نقل چور سہیلی کہہ کر اس کا مذاق اڑایا، اسے ٹیچر اور اپنے والدین سے بھی ڈانٹ پڑی اور تب فاطمہ کو احساس ہوا کہ ٹیچر اور ماما، بابا کو دھوکہ دے کر اپنی مدد آپ کرنے کے بجائے دوسروں کی نقل کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ پھر فاطمہ نے اپنے والدین، ٹیچر اور مریم سے باری باری معافی مانگی۔ سب نے اسے معاف کر دیا اور فاطمہ نے پکا ارادہ کیا کہ اب وہ دل لگا کر پڑھے گی اور کسی کی بھی نقل کرنے کی بجائے اپنی محنت سے اچھی پوزیشن حاصل کرے گی۔

نیا گھونسلا

صبور مشتاق حسین۔ کراچی

دریا کے کنارے ایک گھنے درخت پر ایک چڑیا اور چڑے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اتفاق سے اس درخت پر ایک لکڑہارے کی نظر پڑ گئی جسے اپنے لیے لکڑی چاہیے تھی۔ بس پھر کیا تھا، لکڑہارے نے اپنی کلہاڑی اٹھائی اور درخت پر چلانی شروع کر دی۔ درختوں پر رہنے والے پرندوں نے جب اپنی دنیا اجڑتی دیکھی تو انھوں نے درختوں سے اڑ کر زور زور سے چیخنا چلانا اور لکڑہارے کے سر پر منڈلانا شروع کر دیا۔ لیکن لکڑہارا ان پرندوں کی پروا کیے بغیر پے در پے درخت پہ کلہاڑی چلاتا رہا اور اسے کاٹتا رہا۔ لکڑہارے کی طرف سے مایوس ہو کر پرندوں نے اپنی راہ لی۔ چڑیا اور چڑے نے بھی وہاں سے اڑ کر کوئی ایسی دوسری جگہ تلاش کرنی شروع کر دی جہاں وہ اپنا نیا گھونسلا بنا سکیں۔ غم سے نڈھال دونوں ایک دکان کے اوپر لگے ہوئے سائن بورڈ پہ آ بیٹھے اور چڑیا اپنے پروں میں چونچ دے کر سسکیاں بھرنے لگی۔ چڑیا کو روتے دیکھ کر چڑے کا دل کٹ کے رہ گیا اور اس نے چڑیا سے کہا: "اس طرح روؤ گی تو میری ہمت بھی ٹوٹ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو، آؤ ہم دونوں مل کر اپنا نیا ٹھکانا تلاش کریں۔"

چڑے کے ہمت دلانے پر چڑیا نے اپنے آنسو پونچھے اور دونوں وہاں سے اڑ کر اپنے لیے نیا ٹھکانا ڈھونڈنے چل دیے۔ اڑتے اڑتے انھیں ایک جگہ پیپل کا درخت نظر آ گیا۔ چڑیا اور چڑا خوشی خوشی درخت کی ایک شاخ پر آ بیٹھے اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد دونوں درخت کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ درخت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ، نیچے والی شاخ سے اوپر والی شاخ پہ اور درخت کے اندر کی طرف زیادہ گھنے حصے کی طرف بھی گئے اور تمام درخت کا جائزہ لیا۔

پھر دونوں اڑ کر درخت کے جڑوں والے حصے کی زمین پر آ بیٹھے اور پھدک پھدک کر دانہ دنکا اور کیڑے مکوڑے چگنے لگے۔ اس طرح وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں درخت کی زمین کے اندر کسی موذی جانور (سانپ وغیرہ) نے اپنا بل تو نہیں بنایا ہوا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دونوں نے درخت کے اندر گھنی جگہ کو چن کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اب دونوں صبح سے شام تک اڑ اڑ کر پتلے پتلے، نرم اور مضبوط تنکے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور انھیں ترتیب سے رکھتے جاتے۔ چڑیا ساتھ ہی انھیں جوڑتی رہتی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ نیم کی پتیاں اور چھوٹے چھوٹے کپڑوں کی دھجیاں اور روئی وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے رہتے۔

اس دفعہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا گھونسلا ذرا بڑا اور مضبوط بن جائے جس کے لیے وہ ہر وہ چیز اپنے گھونسلے میں لگا رہے تھے جو انھیں مل رہی تھی۔ چڑے کا ارادہ تھا کہ اس دفعہ ایسا گھونسلا بنایا جائے جو برسات میں بھی محفوظ رہے جس کے لیے اس نے پلاسٹک کی ایک مضبوط تھیلی ڈھونڈی اور اسے اپنی چونچ میں دبا کر لایا، پھر اس نے اس سے گھونسلے کے بیرونی حصے کو ڈھک دیا۔

چڑے نے اپنی مہارت اور کاریگری سے اپنے گھونسلے کو بیرونی طور پر مضبوط، خوب صورت اور ذرا اونچا بنایا تھا جس کے لیے اس نے نیم کے پتلے پتلے تنکے، پیپل کے ذرا موٹے موٹے ڈنٹھل اور پتنگوں کی وہ ڈور جو کٹ کر درختوں میں الجھ جاتی ہے، وہ ڈور بھی استعمال کی تھی۔ دوسری جانب چڑیا نے بھی اپنی سلیقہ مندی سے گھونسلے کے اندر کے حصے کو سجا اور سنوار کر آرام دہ بنایا جس میں اس نے دھاگوں کے لچھے اور کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی دھجیوں پر نیم کی پتیاں بچھائیں جس کے اوپر نرم نرم پتیوں کا بستر بنایا اور گھونسلے کے کناروں میں رنگین کاغذ لگائے۔ یہ پتنگیں چڑیا کو درختوں پر الجھی ہوئی مل گئی تھیں۔ چڑیا اور چڑے کا یہ گھونسلا دیکھنے کے لیے مختلف پرندے دور دور کے درختوں سے آتے اور ان دونوں کو اتنا اچھا گھر بنانے پر مبارک باد دیتے تھے۔

چڑیا نے کچھ دن بعد اللہ کے فضل سے چار انڈے دیے اور پھر ان چاروں میں سے بچے بھی نکل آئے۔ چڑیا اور چڑا اپنے بچوں کے ساتھ اس نئے گھونسلے میں ہنسی خوشی رہتے رہے اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہے جس نے انہیں نیا گھونسلا بنانے کی ہمت اور توفیق دے دی تھی۔ n

میری پہلی تقریر



''ندا آپا! آپ میری تقریر جلد از جلد پڑھیں، اسکول میں پرسوں مقابلہ ہے۔'' مایا نے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے عجلت میں کہا، مگر گرمی سے پریشان آپا فی الحال کسی دوسری بات پر توجہ دینے کو تیار نہ تھیں، اس لئے بے زاری سے بولیں، ''دیکھ نہیں رہی ہو، میں کھانا پکانے میں مصروف ہوں، ابو کو کہو۔'' ''اف...... آپا! میں کہاں جاؤں، میں نے ابو کو کہا تھا میری تقریر پڑھ لیں، پر ابو بھی یہی کہہ رہے ہیں میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے بہت کام ہیں، ابو نے کہا آپ تقریر پڑھ لیں اور آپ ابو کے لئے کہہ رہی ہیں، کسی کے پاس بھی وقت نہیں ہے، آخر میں کس کو کہوں؟ مایا نے روتے ہوئے اپنی پریشانی بیان کی۔ ''اچھا تم رو نہیں، میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کے تمہاری تقریر پڑھتی ہوں۔'' اسی وقت دونوں کی امی شائستہ بیگم کچن میں داخل ہوئیں اور روتی ہوئی مایا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے ندا، مایا! اور یہ کیوں رو رہی ہے؟'' ندا نے امی کا سوال سنا تو اپنی چھوٹی بہن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''بس امی! اسے عادت پڑ گئی ہے رونے اور پریشان ہونے کی، ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہے۔'' یہ سن کر مایا، ندا سے لڑ پڑی اور تیزی سے بولی، ''ارے یہ ذرا سی بات ہے، پرسوں میری تقریر کا مقابلہ ہے، اور آپ بلکل میری مدد نہیں کر رہیں۔'' ندا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا، ''تو کیا ہوا؟ دیکھیں امی! تقریر پڑھنے کے لئے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اور مجھے کام بھی نہیں کرنے دے رہی۔'' یہ سن کر مایا کا غصہ مزید بڑھ گیا، ''دیکھا امی! کتنے نخرے کر رہی ہیں آپا، اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو پتا چل جاتا کہ تقریر کا مقابلہ کتنا مشکل ہوتا ہے، اس کے لئے کتنی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اب تو جیسے بحث کا ایک طوفان اٹھ چکا تھا، دونوں بہنوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا، دونوں بہنیں زور و شور سے لڑنے کو تیار تھیں، کہ اچانک امی نے کہا۔ ''بس اب بہت ہو گیا، چپ ہو جاؤ، تم دونوں کی لڑائی نے میرے سر میں درد کر دیا ہے، سارا دن تم دونوں جھگڑتی ہو، کبھی پیار سے بات کر لیا کرو۔'' یہ سن کر مایا اپنے کمرے میں چلی گئی، جبکہ ندا دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

دونوں بہنوں کی آپس میں بلکل نہیں بنتی تھی۔ روزانہ کسی نہ کسی بات پر لڑتی جھگڑتیں اور پھر امی یا ابو ان کی صلح صفائی کرواتے۔ بڑی آپا سے لڑتے جھگڑتے کے بعد مایا اپنے کمرے میں پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ مگر دل میں ابھی بھی آپا سے بدظن تھی اور سوچ رہی تھی، پتا نہیں آپا اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں۔ میں آئندہ آپا کو کوئی کام نہ کہوں گی، بس میں اپنی دوست سے مدد لوں گی۔ مایا ابھی یہ بات سوچ رہی تھی، اچانک کمرے میں امی آ گئیں۔ ''بیٹا! کھانا تیار ہے، آجاؤ۔''

''اچھا امی! میں آرہی ہوں۔'' مایا کتابیں بند کرتے ہوئے بولی۔ کھانا کھاتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ابو نے ندا سے کہا۔ ''واہ ندا! بریانی بڑے مزے کی بنائی ہے، لاجواب! مایا بیٹا! بریانی اچھی بنی ہے؟'' مایا نے خوشدلی سے جواب دیتے ہوئے کہا، ''جی ابو! بہت اچھی بنی ہے بریانی۔'' مگر تبھی ابو نے مایا کے چہرے پر پھیلی اداسی دیکھ لی، انہوں نے فکرمندی سے سوال کی، ''کیا ہوا بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے، کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہی ہو؟'' مایا نے کہا، ''ابو طبیعت ٹھیک ہے بس سر میں تھوڑا درد ہے۔'' اس سے پہلے کہ ابو کوئی جواب دیتے ندا نے گھورتے ہوئے جواب دیا ''اس کا دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں، یہ مجھ سے جلتی ہے۔'' یہ سن کر مایا نے کہا۔ ''جلتی تو آپ ہیں مجھ سے، اس لئے ایسا کہہ رہی ہو۔'' اس بات پر ندا نے ابو سے مایا کی شکایت کرتے ہوئے کہا، ''دیکھا ابو آپ نے یہ چھوٹی ہے مگر ہر بات پر مجھ سے بحث کرتی ہے، دیکھو مایا سدھر جاؤ تم مجھ سے بحث میں جیت نہیں سکتیں۔'' اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مایا جواب دیے بغیر چپ ہو جاتی ''مجھے آپ سے بحث میں جیتنا بھی نہیں ہے میں بس اپنے پہلے تقریری مقابلے میں جیتنا چاہتی ہوں۔'' اور یوں دونوں ایک بار پھر لڑ پڑیں۔ امی نے سر پکڑتے ہوئے کہا، ''اف! چپ بھی ہو جاؤ، آخر تم دونوں کا جھگڑا کب ختم ہو گا؟'' مایا چیخی ''امی! میں کیا کروں، آپا خود جھگڑا کرتی ہیں۔ آپ ندا آپا کو سمجھایئے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں ندا کو بھی سمجھا دوں گی، پتا نہیں تم دونوں کب سدھرو گی۔'' یہ کہہ کر شائستہ بیگم غصے میں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ سب نے کھانا کھا لیا تو ابو بھی کمرے میں چلے گئے۔ اور دونوں بہنوں نے بھی اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔ دوسرے دن مایا اسکول گئی، اپنی دوست کو اپنی تقریر پڑھنے کو کہا، جس کا نام شہناز تھا۔ شہناز کو ساری مجبوری بتائی۔ ''اچھا ٹھیک ہے، لاؤ میں تمہاری تقریر پڑھ لوں۔'' ساری تقریر پڑھ کر شہناز نے کہا۔ ''مایا! تمہاری تقریر بالکل ٹھیک ہے، لگتا ہے کہ تم اس مقابلے میں جیت جاؤ گی۔''

''جی میں ضرور جیت جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر دونوں دوست ہنسنے لگیں۔ چھٹی کے بعد مایا اپنے گھر واپس گئی۔ گھر پہنچی تو کیا دیکھتی ہے ندا بستر پر پڑی ہے اور ٹانگ میں پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ مایا نے امی سے پوچھا۔ جو ندا کے پاس بیٹھی تھیں۔ ''امی! یہ ندا آپا کو کیا ہوا ہے؟''

''بیٹا! صبح ندا سیڑھیوں سے اتر رہی تھی، اچانک پاؤں پھسل گیا، اتنی بری طرح سے گری کہ شدید چوٹ آگئی۔'' یہ سن کر ندا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ مایا کی طرف دیکھ کر بولی، ''مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا بہت دل دکھایا، بہت تنگ کیا۔ اب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مجھے ٹھیک ہونے میں تین مہینے لگ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر ندا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''ندا آپا! آپ معافی نہ مانگیں، میں آپ سے ناراض نہیں، بلکہ معافی تو مجھے مانگنی چاہئے، کیونکہ میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی تھی۔ میں چھوٹی ہوں مجھے آپ سے اتنی بحث نہیں کرنی چاہئے تھی۔ آپ پریشان نہ ہوں یہ چوٹ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔'' مایا نے ندا کو چپ کروایا۔ ندا، مایا کی باتیں سن کر بہت خوش ہوئی اور اس کے گلے لگ گئی۔ ''ندا آپا! میں گھر کا کام کروں گی اور اسکول بھی جاؤں گی۔'' یہ سن کر ندا مسکرائی اور مایا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ویسے سب سے زیادہ خوش ان کے امی ابو تھے... کیونکہ آج انہیں ایک نہیں دو خوشیاں ملی تھیں، ایک طرف دونوں بہنوں کی آخرکار دوستی ہو گئی تھی تو دوسری طرف مایا تقریر کے مقابلے میں بھی جیت گئی۔

پہلا روزہ

نرگس عامر۔ کورنگی

رمضان کا چاند نظر آتے ہی ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں۔

22 کاشان اور کشش کی امی نے ان سے کہا: ”اس بار آپ دونوں کی روزہ کشائی ہو گی۔ آپ کی دادی کی برسی رمضان کو ہوتی ہے، اسی دن آپ کا روزہ رکھواؤں گی۔“

یہ سن کر کاشان بہت خوش ہوا۔ اسے روزہ رکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کئی سال سے امی سے روزہ رکھنے کی ضد کر رہا تھا۔ اس کے برعکس کشش کچھ پریشان ہوگئی، کیوں کہ اسے بھوک بہت لگتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں پورا دن بغیر کھائے پیے کیسے گزاروں گی۔

رمضان کی رونقیں عروج پر تھیں۔ گلیاں بازار نعتوں سے سج گئے تھے۔ مساجد میں بھی بہار آگئی تھی۔ سحر و افطار کا خوب اہتمام ہو رہا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب کاشان اور کشش کو روزہ رکھنا تھا۔ رات کو دونوں جلدی سو گئے۔ امی نے سحری میں جگایا تو انہوں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے اور سب گھر والوں کے ساتھ سحری کی۔ امی نے انھیں روزہ رکھنے کی دعا بھی پڑھوائی۔ کاشان اپنے ابو اور دادا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد میں چلا گیا اور کشش نے امی کے ساتھ گھر میں نماز پڑھی۔ صبح دونوں اسکول چلے گئے۔ اسکول سے آکر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر ظہر کی نماز پڑھی۔ آج ان کے گھر روزہ کشائی میں بہت سے مہمانوں کو آنا تھا جس کے لیے دوپہر سے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کشش کچھ گم صم سی تھی۔ وہ اپنی سہیلی انعم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج انعم اسکول نہیں آئی تھی۔ کشش نے اپنی سب سہیلیوں کو اپنی روزہ کشائی میں آنے کی دعوت دے دی تھی۔ اس نے چھٹی کے بعد انعم کے گھر جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ اسے بھی روزہ کشائی میں آنے کی دعوت دے دے۔

جب وہ انعم کے گھر پہنچی تو انعم ٹی وی پر گانے دیکھ رہی تھی۔ اس کی امی مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر کشش کو بہت حیرت ہوئی۔ اس نے کہا: ”انعم! کیا آج تمہارا روزہ نہیں ہے؟“

انعم نے جواب میں کہا: ”یہ تم سے کس نے کہا؟ میں نے تو سارے روزے رکھے ہیں اور آج بھی میرا روزہ ہے۔“

کشش نے کہا: ”تم روزے میں گانے کیوں سن رہی ہو؟“

انعم بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی: ”تو کیا ہوا؟ روزہ تو منہ میں ہے اور گانے میں کانوں سے سن رہی ہوں۔“

کشش نے کہا: ”گانے تم پورا سال ہی سنتی ہو، اگر رمضان میں نہیں سنو گی تو کیا ہو جائے گا؟ ہم پورا سال تو خود کو برے کاموں سے روک نہیں پاتے، مگر ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ رمضان کے مہینے میں سارے برے کام چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کریں۔“

انعم بولی: ”لیکن نماز تو میں بھی پڑھتی ہوں۔ عبادت اپنی جگہ اور شوق اپنی جگہ!“

کشش نے نرم لہجے میں کہا: ”بری بات ہے انعم، ایسے نہیں کہتے۔ تم تو مجھ سے بڑی ہو۔ کیا تمہارے گھر والوں نے تمہیں روزے اور رمضان کی فضیلت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

انعم کوئی جواب نہ دے سکی تو خاموش ہو گئی۔

کشش کہنے لگی: ”روزہ اس کا نام نہیں ہے کہ ہم صرف کھانا پینا چھوڑ دیں اور دوسروں کی غیبت کریں۔ جھوٹ بولیں، غصہ کریں، فلمیں دیکھیں اور گانے سنیں، ایسے روزے کا ہمیں ثواب بھی نہیں ملتا۔ روزہ آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ غرض ہر چیز کا روزہ ہوتا ہے۔“

کشش کی یہ بات سن کر انعم نے کہا: ”آج تم نے مجھے بہت اچھی باتیں بتائی ہیں۔ اب میں بھی روزے کا احترام کروں گی اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کروں گی۔ تمہارا بہت شکریہ!“

کشش نے اسے اپنی روزہ کشائی میں اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور واپس آگئی۔ پھر وہ سیدھی دادا جان کے پاس گئی اور انھیں ساری بات بتائی۔ دادا جان نے کشش کو شاباشی دیتے ہوئے کہا: ”یہ تو تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔“

کشش بولی: ”دادا جان! یہ ساری اچھی باتیں آپ ہی نے ہمیں بتائی ہیں۔“

شام کو بہت سے مہمان آئے، سب نے کاشان اور کشش کو پھولوں کے ہار پہنائے اور تحفے دیے۔ پھر مقررہ وقت پر سب نے مل کر روزہ افطار کیا۔ کشش سوچ رہی تھی کہ میں روزہ رکھنے سے گھبرا رہی تھی، مگر جب اللہ کی رضا کے لیے روزہ رکھا تو اس نے مجھے صبر عطا کیا۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ اللہ کی خوش نودی کے لیے کوئی کام کیا جائے تو دل کو کتنا سکون اور اطمینان ملتا ہے۔ n

پیروں کے نشان

انس محمود۔ اورنگی ٹاؤن

کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ جنگل کا بادشاہ تھا۔ جنگل کے سبھی جانور اپنے بادشاہ سے ڈرتے بھی تھے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے، کیوں کہ وہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا۔

لیکن پھر وہ وقت بھی آیا جب شیر بوڑھا اور کمزور ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے شکار کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔

ایک روز بوڑھا شیر نہر کے کنارے بڑی مایوسی کی حالت میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، ورنہ میں بھوک سے مر جاؤں گا۔ وہ اس مسئلے کا کوئی حل سوچتا رہا اور پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ اپنے غار کے اندر بیمار ہونے کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا: ”میرا جو بھی دوست میری طبیعت پوچھنے آئے گا، میں اسی کو شکار کر کے اپنی بھوک مٹالوں گا۔“

اس طرح بوڑھے شیر نے اپنے اس پلان پر عمل شروع کر دیا اور اس کا پیٹ بھرنے لگے۔ اس نے اپنے پاس آنے والے اپنے کئی چاہنے والوں اور دوستوں کو اپنے پیٹ میں پہنچا دیا، جب کہ وہ بے چارے تو اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔

ایک دن ایک لومڑی اس کی مزاج پرسی کے لیے آئی۔ لومڑی تو ویسے ہی بہت چالاک ہوتی ہے۔ وہ کوئی بھی کام بغیر سوچے سمجھے نہیں کرتی، اس لیے وہ شیر کے غار کے سامنے کھڑی ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی تو اس کی چھٹی حس نے کام کیا اور بہت جلد اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

پھر لومڑی غار کے اندر داخل ہوئی، مگر دروازے پر ہی رک گئی اور ایک طرف کھڑے ہو کر شیر سے پوچھا: ”بادشاہ سلامت! آپ کیسے ہیں؟“

شیر نے جواب دیا: ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لیکن تم اندر کیوں نہیں آ رہی ہیں؟“

لومڑی جھٹ سے بولی: ”میں اندر تو آنا چاہتی ہوں، لیکن مجھے یہاں سے صاف نظر آ رہا ہے کہ جن جانوروں کے پیروں کے نشان غار کے اندر گئے ہیں، وہ واپس باہر نہیں آئے، اس لیے میرا اندر آ کر آپ کی طبیعت پوچھنا نادانی ہی ہوگی، اس لیے اب میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ!“

اس طرح لومڑی نے اپنی چالاکی سے خود کو شیر کا شکار بننے سے بچا لیا۔n

پھر ثانیہ مسکرادی

حبیبہ نیاز۔ ساہی وال

میری ایک سہیلی کا نام فصیحہ ہے۔ ابھی وہ چھوٹی تھی کہ اس کے ابو کا ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ فصیحہ ایک اچھی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ گھر کے کام کاج میں وہ اپنی ماں کا بہت ساتھ دیتی تھی۔ اس کی کوئی بہن یا بھائی نہ تھا۔ ذہین ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ آتی تھی۔ اسی وجہ سے تمام ٹیچرز اس کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ اس کے اخلاق کی وجہ سے اس کے رشتے دار اور پڑوسی بھی اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

آج فصیحہ جب اسکول پہنچی تو اس کی سہیلی کرن نے اس سے پوچھا: "تمہاری تیاری کیسی ہوئی ہے؟"

فصیحہ نے کہا: "میری تیاری بہت اچھی ہے۔"

دراصل آج مس رخسانہ کو سائنس کا ہفتے وار ٹیسٹ لینا تھا جس کے لیے سبھی طالبات نے خوب محنت کی تھی۔ اس کے قریب ہی ثانیہ بیٹھی تھی، مگر یہ لڑکی فصیحہ سے بہت حسد کرتی تھی۔ فصیحہ کی بات سن کر ثانیہ نے تنک کر کہا: "جب ٹیسٹ ہوگا تو پتا چل جائے گا کہ کس کے نمبر زیادہ آتے ہیں۔ مس رخسانہ کا ٹیسٹ کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

لیکن جب مس رخسانہ نے ٹیسٹ لیا تو واقعی فصیحہ نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ دوسری جانب ثانیہ نے اپنے آگے بیٹھی کنزہ کا پیپر دیکھ دیکھ کر اس کی پوری نقل کر ڈالی۔ کنزہ بے چاری اس ٹیسٹ میں کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی، اس کا پورا پیپر ہی غلط ہو رہا تھا، اس لیے ثانیہ اس ٹیسٹ میں ناکام ہو گئی۔

اگلے دن مس رخسانہ کلاس میں آئیں تو انھوں نے ٹیسٹ کی کاپی واپس دینی شروع کیں تو سب سے پہلے فصیحہ کا نام لیا اور کہا: "شاباش آپ نے 50 میں سے 48 نمبر لیے ہیں۔"

ثانیہ اور کنزہ کے نمبر بتاتے ہوئے مس نے اعلان کیا کہ یہ دونوں فیل ہو گئی ہیں۔ مس نے یہ بھی کہا: "مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔" مس کی بات سن کر دونوں نے خاموشی سے سر جھکا لیے۔ مس نے انہیں اچھی خاصی ڈانٹ پلائی اور پھر وہاں سے چلی گئیں۔

اب تو ثانیہ نے آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے فصیحہ سے بدلہ لینے کا پلان بنایا۔ اگلے روز انگریزی کا پیپر تھا۔ ثانیہ تھوڑ جلدی اسکول آ گئی۔ اس نے کاغذ پینسل اور انگریزی کی کتاب لی اور گراؤنڈ میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے چند سوالوں کے جوابات لکھے اور فصیحہ کے آنے سے پہلے وہ کاغذ اس کی ڈیسک کی دراز میں میں چھپا دیے۔ ٹیسٹ شروع ہوا تو فصیحہ اطمینان سے ٹیسٹ دینے لگی۔ پھر اچانک ثانیہ کھڑی ہوئی اور اس نے مس سے کہا: "مس! فصیحہ نقل کر رہی ہے۔ اس کی ڈیسک کی دراز میں کاغذ رکھے ہیں۔ یہ انہی کو دیکھ کر جواب لکھ رہی ہے۔"

مس نے فصیحہ کی ڈیسک چیک کی تو اس میں واقعی کاغذ رکھے تھے۔ مس نے وہ کاغذ اٹھائے اور فصیحہ کو پکڑ کر میڈم کے پاس لے گئیں اور پوری بات انہیں بتا دی۔

میڈم نے فصیحہ سے پوچھا: "آپ نے نقل کی ہے؟"

فصیحہ نے جواب دیا: "میڈم! دراصل بات یہ ہے کہ ثانیہ مجھ سے حسد کرتی ہے، اس نے مجھے بدنام کرنے کے لیے یہ حرکت کی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اپنے پاس بٹھا کر دوبارہ ٹیسٹ لے لیں۔"

میڈم نے فصیحہ کو اپنے پاس بٹھایا اور وہی ٹیسٹ اس سے دوبارہ لیا تو فصیحہ نے بالکل ٹھیک ٹھیک کر دیا۔

اب میڈم نے چپراسی بھیج کر ثانیہ کو اپنے آفس میں بلوایا اور اس سے کہا: "آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ کل سے آپ اسکول نہیں آئیں گی۔ میں آپ کا نام یہاں سے خارج کر رہی ہوں۔"

یہ سن کر ثانیہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جلدی سے بولی: "میڈم! آئی ایم سوری، پلیز! مجھے معاف کر دیں۔ میں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔"

اس کے بعد ثانیہ نے میڈم کو پوری بات بتا دی کہ اسی نے وہ کاغذ لکھ کر فصیحہ کی ڈیسک کی دراز میں چھپائے تھے۔ میڈم نے پوری بات سن کر اس کی معافی قبول کر لی اور فصیحہ سے کہا: "آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

میڈم کے آفس سے واپس آتے ہوئے ثانیہ نے فصیحہ سے کہا: "فصیحہ! میں تم سے ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں غلط سوچا تھا۔ مگر اب میں تمہاری اچھی دوست بن کر رہوں گی۔"

فصیحہ نے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ اب ہم اچھی سہیلیاں بن کر رہیں گے۔"

یہ سن کر ثانیہ بھی مسکرا دی۔ n

میری کہانی چھپ گئی

فاروق جان۔ کراچی

رفیق پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور بہت محنتی بھی تھا۔ کم عمری میں ہی اس پر کہانیاں لکھنے کا شوق بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہر بار محنت کر کے اچھی سی کہانی لکھتا اور شائع ہونے کے لیے بھیجتا تھا، مگر افسوس کہ کہ اسے ہر مرتبہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کی کہانی ہر بار ہی ناقابل اشاعت قرار دے دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اخبار میں اپنی کہانی نہ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ کرنیں میں اس کی کہانی نہیں ہے تو وہ زور زور سے رونے لگا۔ اس کی آواز غالباً امی نے سن لی تھی۔ انہوں نے زور سے اسے آواز دی: "رفیق! کہاں ہو تم!"

امی کی آواز سن کر رفیق نے جلدی سے اخبار اٹھایا اور آنسو پونچھتا ہوا امی کے پاس چلا گیا۔

"جی امی جان! آپ مجھے بلا رہی تھیں؟" رفیق نے ان سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس، ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے تم ایسا ہی کرتے ہو، کیا بات ہے؟" امی نے پیار سے کہا۔

"امی میں کیا کروں؟ اتنے شوق سے تو کرنیں کے لیے کہانیاں لکھ کر بھیجتا ہوں، مگر ہر بار میری محنت پر پانی پھر جاتا ہے، میری کہانی شائع نہیں ہوتی۔ میرے سب دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں، اس پر افسوس نہ کروں تو کیا کروں؟"

"بیٹا! لیکن رونے سے کچھ نہیں ہوتا، اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو تم پہلے صبر کرنا سیکھو۔" امی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن کب تک اور کتنا صبر کروں؟" رفیق نے امی سے پوچھا۔

"بیٹا! ایک بات ہمیشہ یاد رکھو، اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد نہیں کرتا جو خود اپنی مدد نہیں کرتے اور ناکامیوں سے گھبرا جاتے ہیں۔ تم تو میرے بہادر بیٹے ہو۔ تم اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتے رہو، اور پھر ایک اچھی سی تحریر لکھو جسے اپنے ابو کو بھی دکھالو اور مجھے بھی، اپنی ٹیچر کو دکھالو گے تو اور بھی اچھا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد تم جو تحریر بھیجو گے، وہ کرنیں کے معیار پر پوری اترے گی اور ضرور شائع ہوگی۔ اگر کرنیں والے بغیر سوچے سمجھے ہر تحریر کو شائع کرنے لگے تو پھر اس کا معیار گر جائے گا اور تم ہی لوگ کرنیں کو پسند نہیں کرو گے۔ کیا ایسا ٹھیک ہوگا؟"

"نہیں امی! میں اب سمجھ گیا۔ آپ جو کچھ کہا، بالکل ٹھیک ہے۔ اب میں خوب محنت کروں گا اور بہت جلد "کرنیں" میں میری کہانی چھپے گی۔"

اس دن کے بعد رفیق خوب محنت کرنے لگا، اس نے لکھنے کی خوب مشق کی، اپنے بڑوں سے بھی راہ نمائی لی، اور پھر ایک روز اس کی کہانی کرنیں میں شائع ہو گئی۔ اب رفیق بہت خوش تھا، کیوں کہ وہ کہانی لکھنے میں کامیاب ہو چکا تھا

n۔

پھولوں کے دوست

وقاص اسلم کمبوہ، بارہ میل

”ہماری بھی کیا زندگی ہے! پوری طرح ہوش نہیں سنبھالتے اور جھٹ سے ہمارا قتل کر دیا جاتا ہے۔“ گلاب کے پھول نے دکھ بھرے لہجے میں اپنے ساتھی سے سرگوشی کی۔

”واقعی ہم پر کوئی رحم نہیں کرتا اور نہ اب کوئی ہماری رکھوالی کرتا ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ توڑ کر دکھ پہنچایا جاتا ہے۔ میں دوستی کی علامت سمجھا جاتا ہوں، اس لیے اکثر لوگ مجھے پسند کرتے اور زیادہ توڑتے ہیں۔“ قریب ہی موجود موتیے کے پھول نے بھی ٹھنڈی آہ بھری۔

سرخ گلاب نے درد بھری آواز میں کہا: ”نہیں لوگ مجھے سب سے زیادہ توڑتے ہیں بلکہ توڑ کر نیچے پھینک دیتے ہیں اور پاؤں تلے کچل بھی ڈالتے ہیں۔“

اسی وقت چنبیلی نے بھی جھٹ سے کہا: ”ارے دوستو! انسانوں کو سبھی پھول پیارے لگتے ہیں، خاص طور پہ چھوٹے بچے تو مجھے زیادہ توڑتے ہیں اور کچھ دیر بعد ہی مسل کر پھینک دیتے ہیں۔“

غرض ان دونوں نے اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم کی داستانیں ایک دوسرے کو سنائیں۔

پھر پیلا گلاب انہیں دیکھ کر مسکرایا اور بولا: ”بھئی، میرے تو مزے ہیں۔ مجھے نہ کوئی پسند کرتا ہے، نہ توڑتا ہے اور نہ مجھے دکھ پہنچاتا ہے، کیوں کہ میں لوگوں کو اچھا جو نہیں لگتا۔“

پیلے گلاب کا طنز محسوس کر کے دوسرے پھولوں نے منہ بسور لیا۔

اسکول کے گراؤنڈ میں لگے مختلف قسم کے پھولوں کے پودے موسم بہار میں خوب کھلے ہوئے تھے، لیکن مایوسی ان کی باتوں سے ظاہر تھی، کیوں کہ یہ خوب صورتی چند لمحوں کے لیے ہی ان پر سجتی تھی۔ وہ اپنی بے بسی پر بہت پریشان تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد تمام پودوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سبھی اپنے پھول نہیں کھلائیں گے۔ انہوں نے تمام کلیوں کو حکم دے دیا کہ اب وہ نہ کھلیں، تاکہ اندر سے پھول باہر نہ آسکیں۔

دوسری صبح جب مالی وہاں آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کسی بھی پودے پر پھول نہیں کھلا تھا۔ وہ ہر پودے کو پکڑ کر اوپر نیچے سے تک دیکھتا رہا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ اسی طرح تین دن گزر گئے۔ باغ کا مالی اور دوسرے بچے بھی حیران تھے۔ بہار کے موسم میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بچے اور مالی حیرت سے کھڑے پودوں کو دیکھ رہے تھے کہ احمد کو ایک پراسرار سی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ مگر آوازیں مسلسل آتی رہیں تو احمد نے پھولوں کے قریب جا کر سننے کی کوشش کی۔ واقعی سرخ گلاب والا پودا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے غور سے سنا تو سبھی پودوں کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ انہوں نے احمد سے اپنے شکوے اور شکایتیں کرنی شروع کیں:

”ہم اتنے پیار سے طرح طرح کے پھول کھلاتے ہیں، تاکہ آپ کو خوشیاں دے سکیں۔ آپ کے ماحول کو خوب صورت اور پرسکون بنا سکیں، لیکن ہمارا آپ ذرا بھی خیال نہیں کرتے، بلکہ یہ مالی خود تمام پودوں کے پھول توڑ کر بچوں کو بیچتا ہے۔ اب ہم تب تک پھول نہیں کھلائیں گے جب تک آپ ہم سے یہ وعدہ نہ کریں کہ ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ہمارا خیال رکھیں گے جو ہمارا حق بھی ہے۔“

احمد نے ان کی باتیں سننے کے بعد اپنے دوستوں کو بتائیں اور انہوں نے عہد کیا: ”آئندہ ہم کبھی پھولوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، بلکہ ان کا خیال رکھیں گے اور خواہ مخواہ پھول توڑنے والوں کو ایسا کرنے سے روکیں گے۔“

یہ سن کر سب پھول خوش ہو گئے۔ دوسرے روز صبح اسکول کے گراؤنڈ میں طرح طرح کے پھول معمول کے مطابق کھلے ہوئے تھے۔ سب بچے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لیکن کسی نے بھی انہیں توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اب وہ پھولوں کے دوست بن گئے تھے اور ان کی حفاظت کرتے تھے۔ n

قِصّہ ایک مچھیرے کا

جویریہ بلال......لاہور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دریا کے کنارے ایک مچھیرا رہتا تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن اور راضی خوشی رہنے والا انسان تھا۔ اس کا نام ڈینو تھا۔ وہ صرف مچھلی کا شکار کرتا اور باقی وقت گھر پر گزارتا تھا۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ جب تک پہلی شکار کی ہوئی مچھلی ختم نہ ہو جاتی، دوبارہ شکار پر نہ جاتا۔

ایک دن مچھیرے کی بیوی مچھلی کو صاف کر رہی تھی کہ ایک حیرت انگیز منظر دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ ایک چمکتا دمکتا ہوا موتی مچھلی کے پیٹ میں موجود تھا۔ "ڈینو، ڈینو۔ جلدی سے یہاں آؤ، دیکھو تو مجھے کیا ملا ہے"۔ "بتاؤ تو سہی"۔ ڈینو مچھیرا بولا۔ "یہ دیکھو" اپنی بیوی کے ہاتھ میں ایک موتی دیکھ کر ڈینو بھی حیران رہ گیا اور بولا "اتنا خوبصورت موتی کدھر سے ملا تمہیں، لاؤ مجھے دو، اس کو بیچ کر اس کی صحیح قیمت وصول کرتے ہیں" ڈینو مچھیرا گاؤں کے سنار کے پاس گیا اور اس کو مچھلی کے پیٹ سے نکلا ہوا موتی دکھایا۔ سنار نے کہا۔ "واہ اتنی شاندار چیز...... میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں یہ تم سے خرید سکوں ورنہ اس بیش قیمت موتی کو خریدنے کا موقع میں ہاتھ سے نہ جانے دیتا، تم اسے شہر کے کسی سنار کے پاس لے جاؤ، وہ تمہاری ضرور مدد کریں گے"۔ جب مچھیرا شہر کے سب سے بڑے سنار کے پاس گیا تو وہ بھی حیران اور دنگ رہ گیا اور بولا کہ بھائی میرے پاس بھی اتنے پیسے نہیں کہ میں یہ موتی خرید سکوں، تم ایسا کرو کہ اس موتی کو شہر کے والی کے پاس لے جاؤ، شاید وہ تمہاری مدد کر سکے"۔ مچھیرا موتی کو لے کر شہر کے والی کے پاس چلا گیا۔ اس کو جب موتی دکھایا تو وہ بھی دنگ رہ گیا اور بولا کہ واہ واہ زبردست، یہ موتی تجھے کہاں سے ملا۔ مچھیرے نے سب قصہ سنا دیا۔ شہر کے والی نے کہا۔ "اس قیمتی موتی کے بدلے ہمارے خزانے میں سے جو لے جانا چاہتے ہو، لے جاؤ، تمہارے پاس چھ گھنٹے کا وقت ہے"۔ مچھیرا یہ سن کر خوش ہو گیا۔ اس کے لئے خزانے کے کمرے میں ایک گھنٹہ بھی کافی تھا جبکہ اسے خزانے کے ساتھ 6 گھنٹے رہنے کو مل رہے تھے۔ جب خزانے والے کمرے میں گیا تو ہیرے جواہرات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے چھ گھنٹے میں جو ہاتھ لگا، اٹھایا اور واپس اپنے گھر آ گیا اور موتی کے بدلے ملنے والے خزانے سے اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارنے لگا۔



رعنا کی توبہ

نرگس عامر۔ کراچی

رعنا بہت شرارتی تھی۔ وہ اپنی شرارتوں سے سب کو ستاتی تھی۔ شروع میں تو سب اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے مگر اب سبھی اس سے بیزار ہونے لگے تھے۔ اگر وہ کسی کے گھر جاتی تو ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتی تھی۔ کبھی صوفوں پر کودتی، کبھی ریفریجریٹر کھول دیتی، کبھی بیڈ کے نیچے گھس جاتی اور کبھی پانی گرا دیتی۔ اپنے گھر میں بھی اس کا یہی حال تھا۔ کبھی پرندوں کو پتھر مارتی، کبھی کوئی گملا توڑ دیتی۔ ایک روز وہ اپنے گھر کے لان میں کھیل رہی تھی کہ اس نے ایک چڑیا کو دیکھا جو گھاس پر بیٹھی تھی۔ اس سے اڑا نہیں جا رہا تھا۔ رعنا اسے پکڑنے کے لیے لپکی تو چڑیا نے پھدک پھدک کر بھاگنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں سوئمنگ پول میں جا گری، گرتے ہی وہ پانی میں بری طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ رعنا یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ اس کے بھائی نے چڑیا کو پانی سے باہر نکالا ، لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی، چڑیا مر گئی تھی۔ یہ دیکھ کر رعنا کے بھائی نے اسے ڈانٹا تو رعنا رونے لگی۔ ایک دن رعنا کی ایک آنٹی ان کے گھر آئیں۔ وہ رعنا کی امی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ رعنا کے گھر میں کچھ دن پہلے ایک چوہیا نے بچے دیے تھے۔ رعنا نے چپکے سے ایک بچہ لا کر آنٹی کے پرس میں ڈال دیا۔ کچھ ہی دیر بعد آنٹی کا موبائل بجا تو انہوں نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور اپنا موبائل ٹٹولنے لگیں، اسی وقت ان کے منہ سے زوردار چیخ نکلی۔ پہلے تو کسی کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا، مگر جب اصل بات پتا چلی تو رعنا کی امی نے خاتون سے معذرت کی اور رعنا کو سمجھایا: "بری بات ہے رعنا! ایسا مذاق نہیں کرتے جس سے کسی کی دل آزاری ہو اور آنٹی تو آپ سے بڑی ہیں ناں، پھر بھی آپ نے انھیں تنگ کیا۔"

مگر رعنا کا وہی حال رہا۔ ایک روز ان کے گھر میں بلی کا بچہ آ گیا۔ بس پھر کیا تھا، رعنا نے تو اس کا پیچھا ہی لے لیا۔ وہ بے چارہ ڈر کر جدھر بھاگتا، رعنا اس کے پیچھے ہوتی۔ کمرے میں الماری اور صندوق کے درمیان ایک جھری تھی، بلی کا بچہ اس میں گھس گیا۔ رعنا بھی اس کے پیچھے کمرے میں آئی اور ہر طرف دیکھا، الماری کے پیچھے اسے بچے کی دم نظر آئی تو رعنا نے جھٹ پکڑی اور اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ بچہ چیں چیں کر رہا تھا، لیکن رعنا اسے اور زور سے گھمانے لگی جس پر اس نے پلٹ کر رعنا کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ رعنا نے جلدی سے بچے کو چھوڑ دیا اور زور زور سے رونے لگی۔ بلی کا بچہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ رعنا کی آواز سن کر گھر والے بھی آ گئے۔ رعنا مسلسل رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا۔ گھر والے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور اس کی مرہم پٹی کرائی۔ اس وقت رعنا کو اپنے گھر والوں کی نصیحتیں یاد آ گئیں کہ بلاوجہ کسی کو تنگ نہیں کرنا چاہیے اور نہ کسی کے ساتھ ایسا مذاق کرنا چاہیے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اس نے اسی وقت توبہ کر لی اور یہ عہد کیا کہ اب کسی کو تنگ نہیں کرے گی۔ n

رحم دل بارش

مرزا ظفر بیگ

آسمان کی بلندیوں میں ایک بڑے اور پھولے ہوئے بادل پر بارش کے قطرے طوفان کے منتظر تھے، طوفان آتا تو وہ زمین پر گرتے اور بادل سے زمین پر گرنا انہیں بہت پسند تھا۔ پھر ایک روز پھولا ہوا بادل رنگ بدلنے لگا اور بھاری بھی ہو گیا۔ بارش کے قطرے جان گئے کہ اب طوفان آنے والا ہے۔ پھر گرج چمک شروع ہوئی تو سب قطرے ایک جگہ جمع ہو گئے جہاں انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ زمین پر کہاں اور کس پر گریں گے۔ ان میں بارش کا سب سے بڑا قطرہ رینڈال تھا، اس نے نیچے زمین پر ایک پارک میں اکیلے بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''میں اس آدمی کی ناک پر گروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ نیچے گرنے لگا۔ رینڈال کو دیکھ کر سب قطرے ہنسنے لگے۔ وہ سیدھا اس آدمی کی ناک پر جا کر گرا اور پھٹ گیا۔ آدمی کا پورا چہرہ بھیگ گیا۔ اب دوسرے بڑے قطرے ریز کی باری تھی۔ وہ ایک عورت کی آنکھوں پر جا کر گرا اور اس کے لباس کے ساتھ اس کا میک اپ بھی خراب کر دیا۔ باقی قطرے یہ دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی آوازیں پورے بادل کے اندر گونجنے لگیں۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے بارش کے سبھی قطرے گرتے چلے گئے۔ کوئی کتوں پر گرے تو کوئی اخبار پڑھتے ہوئے لوگوں پر، کسی نے چم چماتی کاروں کو نشانہ بنایا تو کسی نے کھانے پینے کی چیزیں بھگو دیں۔ کچھ دیر بعد بارش کے صرف وہ قطرے بچے تھے جو سب سے چھوٹے تھے۔ وہ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنے گروپ بنا لیے۔

پہلا گروپ ایک ساتھ مل کر چیونٹیوں کے چھتوں پر گرا جس سے گھبرا کر چیونٹیاں ادھر ادھر بھاگنے لگیں اور آخر بارش کو برا بھلا کہتی ہوئی اپنے بلوں میں گھس گئیں۔ دوسرا گروپ کچھ بچوں کی کھانے پینے کی چیزوں پر گرا اور انہیں بھگو دیا۔ وہ بچے رونے لگے۔ تیسرے گروپ کے لیڈر نے کہا: ''ہم اس عورت کو نشانہ بنائیں گے۔ وہ ابھی ابھی بیوٹی پارلر سے باہر نکلی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ سب ایک ساتھ اس عورت پر گرے اور اس بے چاری کے سارے بال خراب کر دیے جو اس نے تھوڑی دیر پہلے سیٹ کرائے تھے۔ بارش کے تمام قطرے خوش تھے سوائے ریکا کے گروپ کے جو ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ انہیں اپنے ساتھیوں کا یہ مذاق پسند نہیں آیا تھا۔ ریکا نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''ہمیں زمین کے لوگوں کو دکھ دینے کے بجائے ان کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہیے۔ نیچے غور سے دیکھو کہ کہاں بارش کی ضرورت ہے اور اس جگہ برس جاؤ۔'' چناں چہ سب نے بڑے غور سے نیچے دیکھا۔ ایک بچہ آئس کریم کھا رہا تھا۔ ایک فیملی پارک میں پکنک منا رہی تھی۔ ایک جگہ شادی کی تقریب ہو رہی تھی، ان سب پر بارش برسانے کا مقصد انہیں پریشان کرنا تھا، اس لیے ان سب نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ اچانک بارش کے سب سے چھوٹے قطرے ریلی نے ایک جگہ مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھا تو تڑپ اٹھا اور بولا: ''اس پھول کو ہماری ضرورت ہے۔'' یہ سن کر ریکا نے بھی اس پھول کو دیکھا اور اس کی ہدایت پر وہ سب مل کر اس پھول پر برس گئے جس کے نتیجے میں لمحوں میں وہ پھول کھل اٹھا۔ یہ دیکھ کر بارش کے تمام بڑے قطرے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے کہا: ''ہم بارش کے قطرے ہیں، ہمارا اصول یہ ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے بجائے انہیں پریشان کیا جائے۔ لیکن تم نے ہمارے اصول کی خلاف ورزی کی ہے، اس لیے اب تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ نکل جاؤ ہمارے گروپ سے!''

بارش کے ننھے منے قطروں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر خوشی کے نعرے لگائے اور بارش کے ظالم قطروں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ دوسری جانب طوفان تھم گیا اور بارش بھی رک گئی تو سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا جس نے گیلی زمین کو خشک کر دیا۔ زمین کا پانی ایک بار پھر بھاپ بن کر اڑ گیا اور آسمان میں نئے بادلوں کی شکل اختیار کر گیا۔ ریکا اور ریلی نے ایک نئے بادل کو اپنا گھر بنا لیا۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ بارش کے ظالم قطرے انہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔ آج بھی بارش کے رحم دل قطرے جب کبھی بارش کی صورت میں زمین پر برستے ہیں تو وہ اچھے کام کرتے ہیں، ظالم قطروں کی طرح نہ وہ کسی کے گھر اجاڑتے ہیں اور نہ لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں، بلکہ ان کی وجہ سے ہر طرف بہار آتی ہے، ہریالی آتی ہے اور لوگ ان رحم دل قطروں کی وجہ سے خوش ہو جاتے ہیں۔ n

رزلٹ آیا خوشیاں لایا

[illegible] ..... کراچی

''امی! کل ہمارے اسکول کا [illegible] اعلان ہونے والا ہے۔'' سعود نے اپنی امی کو بتایا۔ ''اور والدین کو بھی جانا ہے۔'' سعود نے بات مکمل کی۔ ''ٹھیک ہے بیٹا! کل ہفتہ ہے تمہارے ابو بھی گھر پر ہوں گے، ہم دونوں کل اسکول آئیں گے۔ کل کس وقت جانا ہے؟'' امی نے سوال کیا۔ ''امی! کل صبح نو بجے رزلٹ اناؤنس کیا جائے گا۔'' سعود نے جواب دیا۔ سعود پانچویں جماعت کا ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھا جو ہر جماعت میں اول آتا تھا۔ اس بار بھی سعود کو پوری امید تھی کہ وہ اول آئے گا۔ خیر سعود نے رات کا کھانا کھایا اور سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے بھی وہ اپنے رزلٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کل کیا ہوگا، کون کون پوزیشن لے گا، میرے کیا نمبر آئیں گے؟ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

صبح الارم کی آواز سے سعود کی آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے اس نے نماز پڑھی پھر نہا کر اسکول کا لباس پہنا اور ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ابو بھی تیار ہوکر آگئے، سب نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا، پھر سعود اپنے امی، ابو کے ساتھ اسکول کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسکول پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سب اساتذہ اور کچھ بچوں نے مل کر اسکول کو بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اسکول گراؤنڈ میں سب بچوں کے والدین کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اسٹیج بھی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سب سے پہلے تقریب کا آغاز قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت سے ہوا، اس کے بعد پرنسپل نے آکر تقریر کی۔ وہ ایک ایک کرکے ساری جماعتوں کا رزلٹ اناؤنس کر رہے تھے۔ سب سے پہلے جماعت اول پھر دوسری، تیسری، چوتھی اور اب پانچویں جماعت کی باری تھی۔ سعود کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے تیسری پوزیشن لینے والے طالب علم کے نام کا اعلان کیا۔ ''تیسری پوزیشن کا حقدار ہے عبداللہ! اب باری ہے دوسری پوزیشن کی۔ دوسری پوزیشن حاصل کرنے والا طالب علم ہے احمد!'' سب لوگ تالیاں بجا کر پوزیشن لینے والے بچوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ عبداللہ اور احمد اسٹیج پر پہنچ چکے تھے، انہیں ان کی ٹرافی بھی مل چکی تھی۔

[illegible] کا اعلان ہونے والا تھا۔ پرنسپل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پہلی پوزیشن لینے والا ذہین بچہ ہے سعود!'' پورا گراؤنڈ تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ سعود خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی اسٹیج پر گیا، پرنسپل نے اسے ٹرافی دی۔ اسکول کی انتظامیہ نے کیمرے والے کو بھی بلایا تھا جو پوزیشن لینے والے بچوں کی تصاویر کھینچ رہا تھا۔ اس نے سعود کی تصویر کھینچی۔ سعود کو پورا سال اپنی کاپیوں کا کام مکمل کرنے اور اسے صاف ستھرا رکھنے پر بھی ایک انعام ملا۔ سعود کے ٹیچر کا کہنا تھا کہ سعود کاپی پر ایسے لکھتا ہے گویا کسی لڑی میں موتی پروئے ہوئے ہوں۔ اس کے سارے ٹیچر اس سے بہت خوش تھے، سب نے سعود کی بہت تعریف کی۔

اسکول سے فارغ ہوکر تینوں گھر آگئے۔ سعود کے امی اور ابو دونوں بہت خوش تھے۔ سعود نے امی سے کہا۔ ''امی! آپ مجھے آئسکریم منگوا کر دے سکتی ہیں، اب تو سردیوں کا موسم بھی چلا گیا ہے، گلا خراب ہونے کا اور بیمار ہونے کا خدشہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اب تو گرمیاں ہیں۔''

''ہاں...... ہاں بیٹا! کیوں نہیں بلکہ آج تو میں آئسکریم کے دو ڈبے منگواؤں گی۔ تمہاری چاچی کا فون آیا تھا، آج تمہارے کزنز کا بھی رزلٹ نکلنا تھا، انہوں نے بھی اچھی پوزیشن حاصل کی ہے، ہم سب مل کر آئسکریم کھائیں گے۔ وہ بھی بس آتے ہی ہوں گے۔''



ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ چاچی اور سعود کے کزنز یعنی صبا، علی اور اسد بھی آگئے تھے۔ سب بچوں نے ملتے ہی ہلا گلا شروع کردیا۔ سب نے خوب مزے سے آئسکریم کھائی۔ بڑے اپنی باتوں میں مصروف ہوگئے اور چھوٹے بچے سب سعود کے کمرے میں جمع ہوگئے۔ ''اچھا ہوا رزلٹ آگیا اور سب نے بہت اچھے نمبر لیے، اب ہم بغیر کسی روک ٹوک کے کھیل سکتے ہیں۔'' اسد نے کہا۔ ''ہاں...... ہاں جب رزلٹ نہیں آیا تھا تب تک پریشانی ہی لگی رہتی تھی۔'' صبا نے بھی فوراً کہا۔ ''چلو اب یہ سوچو کہ ہمیں کھیلنا کیا ہے۔'' علی نے سب سے دریافت کیا۔ ''بس تھوڑا آرام کرلیں، دوپہر کی تیز دھوپ تھوڑی کم ہوتی ہے تو ہم صحن میں جا کر کھیلیں گے، مزے کی بات تو یہ ہے کہ آج رات ہم یہیں رکیں گے۔'' اسد نے کہا۔ یہ سن کر سعود بہت خوش ہوا اور کہا۔ ''پھر تو ہمارے پاس کھیلنے کا بہت وقت ہے۔'' اس پر سب مسکرانے لگے اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔

روحی اور سارہ

طوبیٰ جاوید....... کراچی

روحی جیسے ہی اسکول پہنچی سارہ کو خلاف توقع آج غیر حاضر پایا۔ اسے حیرت بھی تھی کہ سارہ نے اسے بغیر بتائے ہی چھٹی کرلی، کیونکہ وہ ہمیشہ اسکول کی چھٹی کرنے سے پہلے اسے مطلع کردیتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج اسکول میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے وہ اداس ہوگئی۔ سارہ اس کی سب سے اچھی سہیلی تھی اور ان دونوں کی اس گہری دوستی کی



ایک وجہ ان کی مما تھیں، دراصل روحی اور سارہ کی مما بھی بچپن کی سہیلیاں تھیں، اور چونکہ دونوں کے گھر قریب تھے اور دونوں بچیاں ایک ہی اسکول میں پڑھ رہی تھیں، اس لئے بچپن سے ہی دونوں ایک ساتھ ہر کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور یہ اس قریبی اور گہری دوستی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کا آج اسکول میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ سارہ کے ساتھ اسکول کا کام کرنے، اس کے ساتھ لنچ کرنے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ اس کا نہ کام کرنے کو جی چاہ رہا تھا اور نہ ہی لنچ کے لئے کینٹین جانے کو... وہ گھر آئی تو اداس تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ سارہ نے چھٹی کس وجہ سے کی۔ شاید وہ بیمار ہوگئی ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ مزید پریشان ہوگئی۔ اور امی سے ضد کرنے لگی کہ مجھے سارہ کے گھر لے چلیں۔ اس کے بے حد اصرار پر اس کی امی اسے سارہ کے گھر لے جانے پر راضی ہوگئیں۔ وہاں جاکر صورتحال معلوم ہوئی تو پتہ چلا سارہ واقعی آج بہت بیمار تھی اور ابھی بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن وہ روحی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اسے جب یہ پتہ چلا کہ روحی اس کیلئے بہت پریشان تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ خدا نے اسے کتنی محبت کرنے والی اور سچی سہیلی عطا کی ہے۔ دل ہی دل میں وہ رب کا شکر ادا کرنے لگی۔ اس واقعے کے بعد دونوں کی دوستی مزید گہری ہوگئی تھی۔ دونوں ہر جگہ ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کی سنگت میں بے حد خوش نظر آتیں اور اگر کبھی چھٹی کرتیں تو ایک دوسرے کو پہلے ہی مطلع کر دیتیں۔

سعد بھائی نے کیا کہا

شائستہ انجم۔واہ کینٹ

آج رات کے کھانے میں امی نے پھر دال پکائی تھی۔احد نے خاموشی اور اداسی سے سر جھکا کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔اتنے میں سعد بھائی بھی دستر خان پر پہنچ گئے جن کا انجینئرنگ یونیورسٹی میں آخری سال تھا۔وہ بہت خوش مزاج اور ہر دل عزیز شخصیت تھے،مگر وہ کھانا ایسے کھا رہے تھے جیسے دال سے زیادہ مزے دار ڈش دنیا میں کوئی نہ ہو۔ساتھ ہی وہ امی کے ہاتھ کی پکی ہوئی دال کی تعریف بھی کیے جا رہے تھے۔مگر سب نے یہ بھی محسوس کیا کہ احد خاموش اور چپ چپ سا تھا۔کھانے کے بعد احد اپنے کمرے میں چلا گیا اور بے دلی سے اپنی درسی کتابیں نکال کر پڑھنے لگا۔اتنے میں سعد بھائی کمرے میں داخل ہوئے اور بولے:"احد!کیا بات ہے؟آج تم بہت اداس نظر آرہے ہو،خیریت تو ہے؟اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ،شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔"

احد تلخی سے بولا:"نہیں،میری کوئی مدد نہیں کر سکتا،آپ بھی نہیں۔"

"کیا ہوا،کچھ بتاؤ تو سہی۔" سعد بھائی نے کہا تو احد ایک دم پھٹ پڑا:"آخر ہم اتنے غریب کیوں ہیں؟میرے دوست اچھے اور مہنگے اسکولوں میں پڑھتے ہیں،جب کہ میرے اسکول میں ٹوٹے پھوٹے ڈیسک ہیں۔نہ سردی سے بچاؤ کا کوئی انتظام ہے اور نہ گرمی سے۔کئی بار تو ڈیسکوں کمی کی وجہ سے ہمیں زمین پر بیٹھنا پڑتا ہے۔میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔میں بھی اچھے اسکول میں پڑھنا چاہتا ہوں۔بہترین نیا یونی فارم،نیا اسکول بیگ اور چمکتے جوتے پہننا چاہتا ہوں،مگر یہ سب میرے پاس نہیں ہے۔"

یہ سب سن کر سعد بھائی کھلکھلا کر ہنس دیے اور بولے:"ارے بس اتنی سی بات پر تم اداس ہو!"

احد بولا:"کیا یہ معمولی سی بات ہے،جب کہ اسی وجہ سے میرا اسکول میں جانے کو دل نہیں چاہتا۔پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔"

سعد بھائی بولے:"کیا زیادہ فیس والے اسکولوں میں پڑھنے سے تم ذہین کہلاؤ گے؟زندگی میں مقصد حاصل کرنے کے لیے مستقل محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔میں نے بھی اسی اسکول سے میٹرک کیا تھا اور مجھے اچھے کالج میں داخل بھی مل گیا۔تمھیں یاد ہوگا کہ پچھلی گرمیوں میں لوڈشیڈنگ کے دنوں میں مجھے گلی میں لگے بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرنی پڑی تھی اور آج میں یونی ورسٹی میں ہوں۔میں اپنے کچھ ایسے دوستوں کو جانتا ہوں جو بے شمار سہولتوں کے باوجود یونی ورسٹی تک نہیں پہنچ سکے۔ہمیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں اسکول بھی میسر ہیں اور بغیر سہولتوں کے تعلیم دینے والے عظیم اساتذہ بھی،ورنہ ملک میں لاکھوں بچے اسکول اور بنیادی تعلیم تک سے محروم ہیں۔اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔یاد رکھو کہ محنت اور خود اعتمادی سے ہم اپنے دن بدل سکتے ہیں۔لیکن اگر مشکلات سے گھبرا گئے تو ہم سو سال بعد بھی اتنے ہی غریب ہوں گے جتنے آج ہیں۔"

احد کے دل و دماغ میں سعد بھائی کی باتیں اترتی چلی گئیں۔کچھ دیر بعد احد بولا:"بھائی!میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی قسمت بدلنے کے لیے دن رات محنت کروں گا۔"

سعد بھائی نے اس کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے پیار سے کہا:"یہ ہوئی نا بات!"

یہ سن کر احد بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔n

صبا کی نرسری

حرا شاہ۔ کراچی

صبا ایک بہت پیاری اور ذہین بچی تھی۔ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا تھا۔ اس کے ابو ایک سائنس داں تھے۔ انہیں علم نباتات میں بڑی مہارت تھی۔ صبا اکثر انہیں پودوں پر تجربات کرتے دیکھتی تھی، اسی لیے اسے پودوں اور درختوں سے کافی دل چسپی تھی۔ صبا ہر روز اسکول جاتے ہوئے ایک خوب صورت نرسری کے سامنے سے گزرتی تو اس میں لگے ہوئے مختلف پھول پودیا سے اچھے لگتے تھے۔

ایک روز وہ حسب معمول اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی اور نرسری کے قریب پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کچھ عرصہ پہلے جہاں ایک نرسری قائم تھی، اب وہاں خالی زمین ہے۔ مشینوں سے تمام درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوئے۔ اس کے ابو گاڑی چلا رہے تھے اور صبا ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ صبا ان سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہے۔ چناں چہ انہوں نے صبا سے کہا: ”کیا ہوا بیٹا؟ پریشان کیوں ہو؟“

صبا نے کہا: ”یہ لوگ اس نرسری اور درختوں کو کیوں کاٹ رہے ہیں؟“

ابو نے کہا: ”یہاں ایک شاپنگ مال بنے گا۔“

”ابو! کیا اس طرح درخت کاٹنے سے انہیں درد نہیں ہوتا۔ ان درختوں پر چڑیوں اور پرندوں نے اتنی محنت سے اپنے گھونسلے بنائے تھے!“

یہ سن کر صبا کے ابو بھی سوچ میں گم ہوگئے۔ اسکول آگیا تو صبا گاڑی سے اتر گئی۔ دن بھر وہ چپ چاپ اور کسی سوچ میں کھوئی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جن پودوں سے انسانوں کو آکسیجن ملتی ہے، انہی سے سبزیاں اور پھل ملتے ہیں اور انہی کو کاٹا جا رہا ہے، کیوں؟ اسکول سے گھر آنے کے بعد بھی اس کا یہی حال رہا۔

شام کو جب اس کے ابو دفتر سے واپس گھر آئے تو وہ صبا کے پاس گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ صبا پریشان ہے۔ انہوں نے صبا سے کہا: ”بیٹا! میں آپ کے لیے کچھ تحفے لایا ہوں۔“

صبا نے ابو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے۔ باہر اتنے پیارے پھولوں اور پودوں کے گملے تھے جنہیں دیکھ کر صبا خوش ہوگئی۔

پھر ابو نے اس سے کہا: ”دیکھو بیٹا! دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: کچھ اچھے اور کچھ برے۔ اچھے لوگ، برے لوگوں سے اس لیے مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ دنیا کا خیال رکھتے ہیں۔ جتنا بھی برا ہو، وہ اسے اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر کوئی درخت کاٹتا ہے تو بہت سے لوگ نئے پودے درخت لگاتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں جس سے نہ صرف وہ ثواب کماتے ہیں، بلکہ زمین کے دوست بھی بن جاتے ہیں۔ اگر آپ اچھے لوگوں میں شامل ہونا چاہتی ہیں تو آپ بھی ان کی طرح ان پودوں کا خیال رکھیں۔ اپنی پاکٹ منی سے پودے خریدیں اور انہیں زمین میں لگائیں۔ پھر آپ کو کسی درخت کے کٹنے کا دکھ نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی جگہ آپ ایک نیا درخت لگادیں گی۔“

صبا نے ابو کی باتیں غور سے سنیں اور ان پر عمل بھی کیا۔ آج صبا کے گھر کا لان طرح طرح کے سرسبز پودوں سے مہک رہا ہے۔n

سموسوں کے پیسے

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

ابرار اور اسرار اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس رمضان میں انہوں نے ابو امی کے منع کرنے کے باوجود روزہ رکھنے کی ضد کی۔ ابو نے انہیں سمجھایا: ”ابھی تمھاری روزہ رکھنے کی عمر نہیں ہے اور گرمی بھی زیادہ ہے، روزہ رکھنے کے لیے اس کی تمام شرائط بھی پوری کرنی ہوں گی۔“

مگر جب سحری کا وقت ہوا تو دونوں بھائی اٹھ گئے، انہوں نے سحری کی اور روزہ رکھ لیا۔ ابو اور امی کی ہدایت کے مطابق قرآن پاک کی تلاوت بھی کی اور تمام نمازیں بھی ادا کیں۔ اس دوران چھٹیوں کا کام بھی کیا۔ پورا دن خیریت سے گزر گیا۔

افطار سے کچھ دیر پہلے کچھ مہمان آگئے جنہیں امی اور ابو نے افطار کے لیے روک لیا۔ امی نے ان دونوں کو بازار سے سموسے لانے کو کہا۔ اگرچہ دونوں نڈھال ہو چکے تھے، مگر پھر بھی بازار چلے گئے۔ راستے میں ایک فقیر ان سے مسلسل مدد مانگتا رہا۔ ابرار نے اسے جھڑک کر کہا: ”جاؤ بابا، تنگ نہ کرو۔ ایک تو اتنی گرمی، بھوک پیاس سے برا حال ہے، پھر ہمارے پاس فالتو پیسے بھی نہیں ہیں۔“

یہ دیکھ کر اسرار نے ابرار سے کہا: ”بابا کو اس طرح مت جھڑکو، بلکہ آرام سے منع کر دو۔ ویسے بھی روزہ ہمیں صبر اور برداشت سکھاتا ہے۔“

غرض وہ دونوں سموسوں کی دکان پر پہنچے جہاں حسب توقع بہت رش تھا۔ دکان دار نے جلدی سے ابرار کو سموسے تو دے دیے، مگر بھیڑ کی وجہ سے پیسے لینا بھول گیا۔ ابرار نے کچھ دیر تو پیسے دینے کا انتظار کیا، مگر گرمی سے گھبرا کر پیسے ادا کیے بغیر واپس چل دیا۔

یہ دیکھ کر اسرار نے کہا: ”بھائی! سموسوں کے پیسے تو دے دو۔“

یہ سن کر ابرار غصے سے بولا: ”میں کون سا مفت میں سموسے لینا چاہتا تھا، مگر دکان دار کے پاس پیسے لینے کا وقت ہی نہیں تو میں کیا کروں؟ ہمارے پیسے بچ گئے، اب ہم رات کو ان پیسوں سے آئس کریم کھائیں گے۔“

یہ سن کر اسرار بولا: ”اگر دکان دار نہیں دیکھ رہا تو کیا ہوا، ہمارا رب تو دیکھ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ہمارا روزہ قبول نہ فرمائے۔ ہم اگر روزہ دار ہو کر بھی اپنے ایمان کی حفاظت نہ کر سکے تو ہمارا روزہ تو گیا! ہمیں دکان دار کو دھوکا دینے کے بجائے کسی بھی طرح سموسوں کے پیسے اسے دینے چاہییں۔“

اسرار کی باتیں سن کر ابرار کو شدت سے احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے، چناں چہ وہ دونوں بھائی سموسے والے کے پاس گئے جہاں اب بھی رش تھا۔ وہ دونوں دکان دار کو نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ ابرار قریب سے دو اینٹیں اُٹھا لایا اور ان پر کھڑے ہو کر اونچا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے دکان دار کو اپنی طرف متوجہ کیا اور جھٹ سموسوں کے پیسے ادا کر کے خوشی خوشی گھر کی راہ لی۔

گھر پہنچے تو امی نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی جس پر دونوں بھائیوں نے تمام واقعہ سچ سچ بتا دیا۔ یہ کہانی سن کر امی بہت خوش ہوئیں اور انہیں شاباش دیتے ہوئے کہا: ”یقیناً اللہ تم سے بہت خوش ہو گا۔“

سیدھا راستہ

سدرہ رحمٰن۔ جوہر آباد، خوشاب

"آمنہ ...... آمنہ جلدی آؤ، پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔"

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے آواز لگائی تو آمنہ بھاگم بھاگ آئی اور قلم مار کر سنبھالتے ہوئے جلدی سے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔

آٹھ بجے اس کا پیپر تھا۔ ہمیں جلدی نکلنا تھا۔ چلنے ہی لگے تھے کہ ماموں کی آواز نے رکنے پر مجبور کر دیا جو کہہ رہے تھے:

"اسد بیٹا! یہ پرچی لیتے جاؤ، اس پر لکھی ہوئی دوا لیتے آنا۔ یہاں سے نہیں ملی۔ شہر میں کسی بڑے میڈیکل اسٹور سے پتا کر لینا، امید ہے کہ ضرور مل جائے گی۔"

"جی اچھا!" میں نے تعمیل میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور ماموں سے پرچی لے کر جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد ہم گھر سے روانہ ہو گئے۔

پونے آٹھ بجے میں نے آمنہ کو ڈگری کالج کے گیٹ کے سامنے اتارا اور اسے اللہ حافظ کہتے ہوئے خود مارکیٹ کا رخ کیا۔ کافی عرصہ بعد اس طرف آنا ہوا تھا۔ وہاں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ اب تو یہاں فلک بوس عمارتیں، مارکیٹیں اور پلازا بڑی تعداد میں تعمیر ہو چکے تھے۔ مین روڈ پر بھی لوگوں اور گاڑیوں کا کافی رش تھا۔ پس ہم نے گلیوں کی خوب خاک چھانی اور اپنی موٹر سائیکل پر سارے شہر کی سیر کرنے کے بعد آخر ایک میڈیکل اسٹور دیکھ کر گاڑی روکی اور پرچی دکھائی تو وہاں سے دوا بھی مل گئی۔ وقت دیکھا تو گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ آمنہ کا پیپر بھی ختم ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی رہ گئی تھی۔ چناں چہ اگلے پندرہ منٹ میں اپنی موٹر سائیکل آہستہ آہستہ چلاتا ہوا ڈگری کالج جا پہنچا۔

کالج سے شہر کی جانب دو راستے جاتے تھے: ایک تو مین روڈ تھا جو ٹھیک ٹھاک بنا ہوا تھا اور دوسری کچی سڑک بھی جو کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی۔ آج چوں کہ رش زیادہ تھا، اسی لیے میں نے کچے راستے سے جانے کا فیصلہ کیا۔

باغات میں سے گزرتے ہوئے عین سنسان علاقے میں پہنچ کر یکایک میری موٹر سائیکل نے نخرہ شروع کیا اور چلنے سے انکار کر دیا۔ سارا شہر گھومنے کا نقصان یہ بھی ہوا تھا کہ اب میری موٹر سائیکل میں پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ میں اور آمنہ، ہم دونوں ہی پریشان تھے کہ اب کیا کیا جائے، یہ راستہ بھی خاصا لمبا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اللہ کا نام لے کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ کئی دفعہ کی کوشش کے بعد آخر موٹر سائیکل ہو ہی گئی۔ خدا کی مدد بھی ہمارے شامل حال تھی۔ میں نے پوری رفتار سے گاڑی کو دوڑایا۔ آخر ایک چھوٹی دکان کے سامنے پیٹرول کی بوتلیں رکھی ہوئی نظر آئیں تو سکھ کا سانس لیا۔ موٹر سائیکل کی ٹنکی میں پیٹرول ڈلوایا اور گھر کی جانب رواں دواں ہوئے۔ اللہ اللہ کر کے گھر پہنچ گئے۔

اس دن کے واقعے نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، جب بھی کسی لمبے راستے کا سفر ہو تو عام دن سے زیادہ پیٹرول ڈلواتا ہوں اور الٹے راستوں کے بجائے سیدھے راستے کو ترجیح دیتا ہوں، تاکہ کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ دنیا بھی ایک سفر کی مانند ہے۔ ہم اس میں ایک مسافر کی طرح ہی ہیں۔ اس میں بھی دو ہی راستے ہمارے اختیار میں ہیں: برائی کا راستہ غلط راستہ ہے۔ اگر اس پر چلو گے تو بھٹک جاؤ گے، برائی یا بدی کے راستے پر چلنے والوں کو ناکامیاں ملتی ہیں، لیکن نیکی کے راستے پر چلنے والے ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ n

شہزادہ منان

عرفانہ عالم۔ ٹیکسلا

کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔وہ بہت رحم دل اور انصاف پسند تھا۔اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا۔اس کے دو بیٹے (شہزادے) تھے۔بڑے شہزادے کا نام حنان اور چھوٹے کا نام منان تھا۔شہزادہ حنان بہت بدتمیز اور گستاخ تھا، جب کہ شہزادہ منان بہت فرماں بردار تھا۔وقت گزرتا رہا اور پھر بادشاہ بوڑھا اور کمزور ہوگیا۔اب وہ وقت آگیا تھا کہ وہ اپنا تخت حکومت اپنے دونوں بیٹوں میں سے کسی ایک کو سونپ دے۔لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ذمے داری کسے سونپے۔وہ ان دونوں کا امتحان لینا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ذمے داری اٹھانے کا اہل کون ہے۔

آخر ایک روز اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اس نے دونوں شہزادوں کو بلوایا اور ان سے کہا:"تم میں سے جو شہزادہ مجھے شمال کی جانب واقع کالے پہاڑوں سے ہیروں والا ہار لاکر دے گا، میں اسے اس ملک کا بادشاہ مقرر کردوں گا۔"

دونوں شہزادوں نے بادشاہ حکم سن کر اپنا ضروری سامان باندھا اور اگلی صبح نمودار ہوتے ہی اس مشکل سفر پر روانہ ہوگئے۔راستے میں وہ ستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔اتنے میں سامنے سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔جونہی وہ عورت تھوڑا سا قریب آئی تو شہزادوں نے دیکھا کہ وہ عورت مشکل سے چل رہی تھی، کیوں کہ اس کے پیر زخمی تھے۔

وہ عورت لنگڑاتی ہوئی بڑے شہزادے کے پاس آئی اور اس سے کہا:"مجھے کچھ کھانے کو دو، میں کافی عرصے سے بھوکی ہوں۔"

بڑے شہزادے نے یہ سنا تو اسے بہت غصہ آیا۔اس نے بوڑھی عورت سے کہا:"دو ٹکے کی عورت! تیری یہ مجال کہ مجھ سے کھانا مانگے۔چلی جا یہاں سے!"

مگر جب چھوٹے شہزادے نے اس عورت کی فریاد سنی تو اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا:"بھائی! یہ ہماری بزرگ ہیں۔ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔"چھوٹے کی بات سن کر بڑے بھائی نے منہ موڑ لیا۔چھوٹے شہزادے نے بوڑھی عورت کو درخت کے سائے میں بٹھایا اور اپنا سارا کھانا اسے کھلا دیا۔بوڑھی عورت نے کھانا کھا کر چھوٹے شہزادے کو ڈھیروں دعائیں دیں جس کے بعد دونوں شہزادے ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔وہ چلے جارہے تھے کہ راستے میں پھر وہی بڑھیا سامنے آگئی۔اسے دیکھتے ہی بڑا شہزادہ آپے سے باہر ہوگیا۔اس نے بوڑھی عورت سے بدتمیزی کرتے ہوئے کہا:"تو پھر آگئی؟ چلی جا یہاں سے ورنہ میں تجھے سخت سزا دوں گا۔"

ابھی شہزادے نے یہ کہا ہی تھا کہ بڑھیا سنہری پری میں تبدیل ہوگئی۔دونوں شہزادے یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔

پری نے شہزادہ حنا اور شہزادہ منان سے کہا:"یہ تم دونوں کا امتحان تھا اور اس امتحان میں شہزادہ منان کامیاب ہوا ہے، جب کہ شہزادے حنان کو اس کی بدتمیزی کی سزا ملے گی۔"یہ کہہ کر پری نے شہزادے حنان کو پتھر کا بنادیا اور شہزادے منان کو تحفے میں جادوئی قالین، جادوئی انگوٹھی اور جادوئی چھڑی دی اور کہا:"جاؤ، خدا تمھیں کامیاب کرے۔"اس کے بعد پری غائب ہوگئی۔

شہزادے منان نے قالین بچھایا اس پر بیٹھ کر کالے پہاڑوں تک پہنچا جہاں اس نے پری کی دی ہوئی جادوئی انگوٹھی پہنی اور کالے پہاڑوں کے اندر داخل ہوگیا۔اس نے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ ہار لے لیا اور پھر باہر آگیا۔اس کے بعد وہ قالین پر بیٹھا اور اس مقام پر پہنچا جہاں اس کا بڑا بھائی پتھر کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔اس نے جادوئی چھڑی نکالی اور اسے اپنے بڑے بھائی پر گھما کر اسے واپس اصل حالت میں لایا اور دونوں بھائی محل واپس آگئے۔بادشاہ وہ ہار پاکر بہت خوش ہوا۔اس نے شہزادہ منان کو ملک کا نیا بادشاہ بنادیا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔n

شہزادی بانو

سارہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ تھا۔ اس کی ایک بیٹی شہزادی بانو تھی۔ بادشاہ کو اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا اور شہزادی بانو بادشاہ کی بہت لاڈلی تھی۔ بادشاہ نے اس کی بیٹوں کی طرح پرورش کی تھی۔ شہزادی بانو کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شہزادی بانو اب بڑی ہوگئی تھی اور بادشاہ اور ملکہ اپنی لاڈلی شہزادی کی شادی کے لئے فکر مند رہنے لگے تھے۔

بادشاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی شہزادی بانو کو بہت سمجھاتے تھے کہ بانو بیٹا اب تم بڑی ہوگئی ہو، اب تمہاری شادی کی عمر ہے، ہم تمہاری شادی کسی شہزادے سے کروانا چاہتے ہیں، اچھا ہے کہ تم ہماری بات مان لو اور شادی کر لو، مگر شہزادی بانو بہت ضدی تھی۔ ابھی وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی اس زندگی سے بہت خوش تھی۔ اس کی کوئی بھی عادت یا خواہش شہزادیوں جیسی نہیں تھی۔ ایک دن بادشاہ نے شہزادی بانو کو اپنے پاس بلایا اور غصے میں کہا۔ ”تمہاری ساری عادتیں اور شرارتیں کل سے ختم ہوں گی اور تمہیں اپنا معمول زندگی تبدیل کرنا ہوگا، اب تم بڑی ہوگئی ہو، کل سے بالکل شہزادیوں کے روپ میں دکھائی دو مجھے۔“ اتنی ڈانٹ سن کر شہزادی بانو بہت افسردہ ہوئی اور اپنے دوست شیرو گھوڑے کے پاس بیٹھ کر روتی رہی۔ اسے کھیلنے کودنے، شرارتوں اور شکار میں ہی مزا آتا تھا۔ وہ بہت بہادر لڑکی تھی، مگر بادشاہ اور ملکہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی شہزادیوں کی طرح محل میں دکھائی دے۔ شہزادیوں جیسا لباس پہنے اور شاہانہ عادتیں اپنا کر ایک مکمل شہزادی دکھائی دے۔

پھر اگلے دن ہی اپنے والدین کی مرضی سے شہزادی بانو نے اپنا طرز زندگی بدل لیا، وہ شہزادیوں جیسے لباس میں ملبوس شہزادیوں والے انداز اپنا کر محل میں قدم رکھتی تھی تو بادشاہ اور ملکہ خوشی سے پھولے نہ سماتے، مگر دل سے بانو بہت مایوس اور اداس تھی۔ اس نئی تبدیلی نے اسے کوئی خوشی نہ پہنچائی تھی۔ دوسری طرف بادشاہ یہ دیکھ کر بہت خوش تھا کہ اس کی بیٹی شہزادی بانو اب سمجھدار اور بڑی ہوگئی ہے اور اس کی شادی کے لئے ایک اچھے لڑکے کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ شادی کے لئے اس کو اچھے اچھے رشتوں کی پیشکش ہوتی ہے مگر شہزادی بانو قبول نہیں کرتی کیونکہ اس وقت وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک رات محل میں سب سو جاتے ہیں تو شہزادی بانو چوری چھپے اپنے گھوڑے شیرو کے ساتھ جنگل چلی جاتی ہے کیونکہ جنگل میں اپنے گھوڑے شیرو کے ساتھ شکار کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جنگل میں شکار کئے بناء اسے چین نہیں آتا تھا۔ اس دفعہ شہزادی بانو جنگل کے دوسرے حصے میں شکار کے لئے چلی جاتی ہے۔ وہاں ایک جھونپڑی دکھائی دیتی ہے، وہ جھونپڑی ایک جادوگرنی بڑھیا کی ہوتی ہے۔ وہ جادوگرنی عورت بہت مکار اور ظالم تھی۔ کتنے ہی لوگوں کی جانیں لے چکی تھی، اپنا بنایا ہوا زہریلا کیک کھلا کے۔ جو بھی لوگ شکار کے لئے آتے، وہ اس بوڑھی عورت کے ہاتھوں شکار ہو جاتے تھے مگر شہزادی بانو کو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب شہزادی بانو اس جھونپڑی میں جاتی ہے تو وہ بوڑھی عورت اسے نظر آتی ہے۔ وہ بوڑھی عورت اسے دیکھ کر پوچھتی ہے، اے لڑکی تم کون ہے؟ تو شہزادی بانو اسے اپنے بارے میں بتاتی ہے، پھر وہ بوڑھی عورت اپنا جادوئی زہریلا کیک شہزادی بانو کو بھی کھانے کے لئے دیتی ہے تو شہزادی بانو اس کیک کو خوشی خوشی قبول کرتی ہے مگر اس وقت نہیں کھاتی اور سنبھال کر اپنے بیگ میں رکھ لیتی ہے کہ گھر جا کر آرام سے کھاؤں گی۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی بانو بوڑھی عورت سے اجازت لے کر واپس محل جانے کا ارادہ کرتی ہے۔

راستے میں تھوڑا ایک شیرو کو کھلاتی ہے تو وہ کھا کر اچانک گر جاتا ہے اور تڑپنے لگتا ہے۔ شہزادی یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو جاتی ہے اتنے میں اس کا پیارا شیرو مر جاتا ہے اور وہ زور زور سے رونے اور چیخنے لگتی ہے اور پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس نے شیرو کو جو کیک کھلایا تھا وہ کیک کھا کر شیرو مر گیا ہے۔ واپس اس جادوگرنی کے پاس جاتی ہے تو وہ وہاں سے غائب ہو جاتی ہے پھر شہزادی مایوس اور اداس واپس محل کی طرف آتی ہے اور چپ کر کے کمرے میں سو جاتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے، بادشاہ اسے اپنے پاس بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ شیرو کہاں ہے، اپنی جگہ پر موجود نہیں ہے تو شہزادی سارا واقعہ بادشاہ کو سناتی ہے اور پھر بہت روتی ہے۔ اپنی ضد اور نادانی پر۔ پھر بادشاہ شہزادی بانو کو سمجھاتا ہے کہ دیکھو بیٹا ہم نے تمہیں بہت سمجھایا تھا، مگر تم سنی ان سنی کر دیتی تھیں، تمہاری اس ضد کی وجہ اور بات نہ ماننے کی وجہ سے شیرو کی جان چلی گئی، تمہیں اس بات کا اب اندازہ ہو رہا ہے۔ اگر تم ہمارا کہنا مانتیں تو شیرو تم سے کبھی دور نہیں جاتا، پھر شہزادی بانو کو اپنی نادانی اور غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر شہزادی شیرو کے دکھ میں بیمار رہنے لگتی ہے۔ بادشاہ، شہزادی کو خوش کرنے کے لیے اسے ایک نیا خوبصورت گھوڑا تحفے میں دیتا ہے۔ جس پر اس کی افسردگی کچھ کم ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ اس کی شادی کروانے کا سوچتا ہے اور ایک شہزادے کا رشتہ شہزادی بانو کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس دفعہ شہزادی بانو کوئی ضد نہیں کرتی اور شادی کے لئے ہاں کر دیتی ہے۔ پھر شہزادی کی شادی شہزادے سے ہو جاتی ہے۔ بادشاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی شہزادی بانو کی شادی کروا کر بہت خوش خوش رہنے لگتے ہیں۔

دیکھا بچو! کہنا بڑوں کا مانو ورنہ اپنی ضد اور نادانی میں اپنی پیاری چیز بھی کھونی پڑ جاتی ہے۔

ایک افریقی کہانی

شیر پھل کیوں نہیں کھاتا؟

مریم فاطمہ۔ کراچی

شیر ایک گوشت خور جانور ہے جو زندہ جانور کا شکار کر کے اس کے تازہ گوشت سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ تازہ اور رسیلے پھل بھی کھاتا تھا، مگر بعد میں اس نے پھل کھانے چھوڑ دیے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آیئے آپ کو ایک افریقی کہانی سناتے ہیں۔

کسی زمانے میں افریقہ میں ایک گیدڑ رہتا تھا۔ ایک دن اس نے پھلوں سے لدے چند درختوں کا کھوج لگایا اور خوش خوش ان کے نیچے پہنچ گیا۔ وہاں درختوں سے گرے ہوئے تازہ پھلوں کا ڈھیر جمع تھا۔ گیدڑ نے للچائی نظروں سے ان پھلوں کو دیکھا اور پھر بے چینی سے انہیں کھانا شروع کر دیا۔

اسی وقت اسے دور سے شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ چالاک گیدڑ نے سوچا کہ آواز سے تو شیر بھوکا لگ رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ اسی طرف چلا آئے اور میرے یہ پھل دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو جائے اور پھر وہ مجھ سے یہ تمام پھل چھین لے۔ یہ سوچ کر وہ فکر مند ہو گیا، کیوں کہ شیر جنگل کا بادشاہ تھا اور کس کی مجال تھی کہ اس کے سامنے دم مار سکے۔ شیر تو جانوروں کے منہ سے خوراک چھیننے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سوچا اور پھر اپنے رسیلے اور میٹھے پھل شیر سے بچانے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ شیر کی دھاڑ اب قریب سے آ رہی تھی۔ مگر گیدڑ نے جلدی جلدی پھل کھانے شروع کر دیے، حالاں کہ وہ جانتا تھا کہ شیر اسے پھل کھاتے دیکھ رہا ہے، پھر بھی اس نے خود کو نہ روکا۔ پھل کھاتے کھاتے اچانک گیدڑ زمین پر گرا اور زور زور سے ہاتھ پیر ہلانے لگا جیسے اسے دورہ پڑا ہو۔ پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا اور آنکھیں ایک ہی جگہ ٹھہر گئیں۔ شیر نے اسے دیکھا اور دل میں کہا: ”یہ پھل زہریلے ہوں گے جبھی یہ بے وقوف گیدڑ انہیں کھا کر مر گیا۔“

اس کے بعد وہ چپ چاپ جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے پر لوٹ گیا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو گیدڑ نے بچے ہوئے تمام پھل ہڑپ کیے، اس کے بعد اسے یاد آیا کہ قریب ہی ایک مرا ہوا گیدڑ پڑا ہے۔ وہ جلدی اسے ادھر گیا، اس کے مردہ جسم کو گھسیٹ لایا اور پھلوں کے چھلکوں کے پاس پٹخ دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنی موت کا ناٹک کیا تھا۔ اس کے بعد گیدڑ خوش خوش اپنے غار کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد شیر وہاں سے گزرا تو اس نے رسیلے پھلوں سے لدے درختوں کو دیکھا اور اس کی بھوک بھڑک اٹھی۔ اسی وقت اس کی نظر گیدڑ کی لاش پر پڑی جسے گدھ نوچ رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ تھوڑی دیر پہلے اسی جگہ گیدڑ کسی بھوکے کی طرح پھل کھا رہا تھا اور زمین پر گر کر تڑپتے ہوئے مر بھی گیا تھا۔ چناں چہ شیر نے اسی جگہ یہ قسم کھائی: ”اب میں زندگی میں کبھی کسی درخت کا پھل نہیں کھاؤں گا۔“

اس دن کے بعد شیر کبھی کسی درخت کے قریب نہیں گیا۔ گیدڑ اور دوسرے جانور اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے کہ چلو اس طرح کم از کم ہمارے بادشاہ سلامت ہماری خوراک تو نہیں کھا سکیں گے۔ شیر نے بھی اپنی قسم کی لاج رکھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی پھل نہیں کھاتا۔n

شارک اور ڈولفن

مرزا محمد عماد بیگ

ایک گہرے سمندر میں سارہ نام کی شارک اور ڈولی نام کی ڈولفن رہتی تھیں۔ سمندر کا ساحل ریتیلا تھا جہاں ایک اونچا لائٹ ہاؤس بھی تھا جس کے قریب ایک تاریک سا دلدلی علاقہ بھی تھا۔ شارک (سارہ) اور ڈولفن (ڈولی) ایک دوسرے کو جانتی تو تھیں، مگر ان میں دوستی نہیں تھی۔ ڈولی کی دو بہنیں بھی تھیں جو مل جل کر پیار محبت سے رہتی تھیں۔ سمندر کے نیلے پانی میں وہ بہت خوش تھیں۔ لیکن سارہ بالکل اکیلی تھی۔ نہ اس کے بہن بھائی تھے اور نہ دوست، اسی لیے وہ ہر وقت غصے میں رہتی تھی۔ اکثر سارہ سمندر میں کاہلی سے تیرتی رہتی تھی۔ اسے اپنی زندگی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب ڈولی اور اس کی بہنوں کو خوش دیکھتی تو اس کا جی چاہتا کہ ان پر حملہ کر دے، کئی بار اس نے کوشش بھی کی تھی، مگر ڈولفن اتنی ہوشیار تھیں کہ وہ اسے دیکھ کر بھاگ جاتی تھیں۔ انہیں سارہ کے تیز دانتوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ڈولی کو یقین تھا کہ سارہ اس کی بہنوں کو کبھی نقصان نہیں پہنچائے گی، مگر پھر بھی وہ احتیاطاً اپنی بہنوں سے کہتی تھی کہ سارہ سے دور رہیں۔

ایک روز ڈولی سمندر میں تیر رہی تھی اور سارہ اس کے پیچھے تھی کہ دونوں تیرتے تیرتے ساحل پر پہنچ گئیں۔ ڈولی نے پانی سے باہر چھلانگ لگائی تو سارہ بھی اس کے پیچھے تھی۔ انہیں ساحل پر کسی عجیب سے جانور کے پنجوں کے نشان نظر آئے جو دلدل تک جا رہے تھے۔ انہوں نے پہلے یہ نشان کبھی نہیں دیکھے تھے۔

دونوں اپنے اپنے حساب سے اندازے لگاتی رہیں کہ یہ کس جانور کے پنجوں کے نشان ہو سکتے ہیں، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔

یکایک انہیں دلدلی علاقے سے کوئی چیز اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے ایک ہرے رنگ کے خوب صورت سے مگرمچھ کو دیکھا جس کے سر پر ہیٹ تھا اور جسم پر لمبا سا لبادہ۔ وہ ڈانس کرتا ہوا آ رہا تھا اور ساتھ ہی میوزک بھی بج رہا تھا۔ انہوں نے غور کیا تو انہیں ایک مینڈک دکھائی دیا جو دلدل کی طرف سے بینجو بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک یورپی چوہے کو دیکھا جو سارنگی بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہ سب سارہ اور ڈولی کے سامنے آ کر خوب ناچنے لگے اور بغیر رکے خوشیاں مناتے رہے۔ جب شام ہونے لگی تو انہوں نے اپنے کام بند کیے اور واپس چل دیے۔ ڈولی اور سارہ انہیں جاتے دیکھ کر افسردہ ہو گئیں، کیوں کہ انہوں نے اتنا پیارا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سارہ سوچ رہی تھی: "یہ تینوں جانور بھی تو اکیلے تھے، مگر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انہوں نے کیسے خوشی منائی تھی۔ ادھر میں ہوں، بالکل اکیلی! کیا میں ڈولی اور اس کی بہنوں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتی؟"

یہ سوچتے ہوئے وہ تیر کر ڈولی کے پاس گئی اور اسے اپنے خیال سے آگاہ کیا۔ جواب میں ڈولی نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔

اگلی صبح کا سورج بہت چمک دار اور سنہرا تھا۔ آج سمندر کی لہریں بھی زیادہ موج میں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈولی اور سارہ ایک ساتھ تیر رہی تھیں۔ ڈولی کی بہنیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ چاروں خوب کھلکھلا رہی تھیں۔ سارہ بہت خوش تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا اور اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اب میں اکیلی نہیں رہوں گی، بلکہ ڈولی اور اس کی بہنوں کے ساتھ رہوں گی۔ سارہ اور ڈولی اس راز کو پا چکی تھیں کہ خوشیاں اکیلے رہنے سے نہیں ملتیں، بلکہ دوسروں کے ساتھ رہنے اور ان کے دکھ درد بانٹنے سے ملتی ہیں۔ n

شرمندگی

محمد وسیم کھوکھر۔ ہیڈ مرالہ

وہ دسمبر کی ایک انتہائی سرد رات تھی۔ دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سبھی لوگ اس سرد رات میں گرم بستروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ لیکن محلے کے اس گھر میں ہمیشہ کی طرح آج بھی تیز تیز بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس سناٹے میں پڑوسیوں کے لیے لڑائی جھگڑے کی یہ آوازیں کوئی انہونی تو نہ تھیں، بلکہ اب تو وہ لوگ ان آوازوں کے عادی ہو چکے تھے۔ یہ گھر کمال دین کا تھا جو اپنے بیٹے رحمت پر ناراض ہو رہا تھا، بلکہ تیز آواز میں اس پر چیخ رہا تھا۔ رحمت ہر روز کی طرح آج بھی گھر دیر سے آیا تھا۔ یہ روز کا تماشا تھا۔ رحمت کا باپ اس پر روزانہ اسی طرح چیختا تھا۔ رحمت کی ماں زہرا محلے میں جب بھی کسی پڑوسن سے ملتی تو ہمیشہ یہ کہتی: "بہن! کیا کروں، رحمت نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے، صبح سے شام تک اپنے ہی کاموں میں الجھائے رکھتا ہے، نہ کھانا سکون کا رہا اور نہ پینا!"

آج بات کافی بڑھ گئی تھی۔ زہرا یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ کبھی اپنے بیٹے کو سمجھاتی تو کبھی شوہر کو، لیکن آج رحمت کے تیور بھی بگڑ چکے تھے۔ ویسے بھی اسکول چھوڑنے کے بعد وہ سارا دن اور رات کو دیر تک دوستوں میں بیٹھا رہتا تھا۔ کمال دین اسے منع کرتا تھا، مگر رحمت نہیں سنتا تھا۔ آج رحمت نے اس خوف ناک رات میں گھر چھوڑنے کے ارادہ کر لیا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا تو اس کی ماں نے اسے روکنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ رکا۔

رحمت باہر نکلا تو اندازہ ہوا کہ یہ رات واقعی بہت خوف ناک ہے۔ شدید دھند نے اس راستے کی دہشت اور ویرانی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ راستہ دشوار اور خطرناک تھا مگر اس کا دیکھا بھالا تھا، بچپن سے اب تک وہ اسی راستے پہ چلا آ رہا تھا۔ وہ غصے میں گھر سے تو نکل آیا تھا، مگر اب پچھتا رہا تھا کہ وہ گھر سے کیوں نکلا اور اگر نکلا تھا تو گاؤں میں ہی کسی دوست کے پاس چلا جاتا۔ اونچے نیچے راستے پہ چلتے ہوئے وہ ٹھٹکا، کیوں کہ قریبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا کہ دو سائے جھاڑیوں سے نکل کر درختوں کے جھنڈ کے پاس جا کر رک گئے۔

"کک۔ کک کون ہے۔" رحمت نے ڈرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہاتھوں میں پستول تھامے اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی، مگر آواز حلق میں پھنس گئی۔ کوئی اور راستہ نہ پا کر اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رحمت کو جب ہوش آیا تو وہ ایک اندھیرے کمرے میں قید تھا۔ اس کے ہاتھ رسیوں سے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ رونے لگا۔

اماں، ابا اور چھوٹی بہن کے چہرے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اچانک اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے انہیں غور سے سنا، وہ ایک سے زیادہ لوگ تھے۔ پھر اسے کسی کے بولنے کی آواز بھی سنائی دی جسے وہ ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اسی دوران کسی نے دروازہ توڑا اور پھر اس کے ابو کمال دین گاؤں کے لوگوں اور کئی پولیس والوں کے ساتھ اندر آ گئے۔ وہ تڑپ اٹھا تھا۔ باپ کا سایہ کتنا مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے، اس کا اندازہ رحمت کو اس وقت ہوا تھا۔ اس کے ابو نے اس کی رسیاں کھولیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

رحمت صرف اتنا کہہ سکا: "ابو! مجھے معاف کر دیں!" خوف اور دہشت کی وجہ سے وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

رحمت جب گھر سے نکلا تو اس کا ارادہ شہر میں اپنے چچا کے گھر جانے کا تھا۔ شہر جانے والی سڑک تک جانے کے لیے جنگل کا ڈیڑھ کلو میٹر کا دشوار گزار راستہ طے کرنا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو اس کے ابو بھی اس کے پیچھے تھے۔ انہوں نے رحمت کو اغوا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموش رہے، کیوں کہ ان لوگوں کے سامنے آ جانے یا للکارنے سے وہ لوگ رحمت کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ جب ان دونوں نقاب پوشوں نے رحمت کو اپنی گاڑی میں ڈالا تو کمال دین بھی دبے قدموں ان کے پیچھے چلے آئے تھے۔ انہوں نے اس گاڑی کو پہچان لیا تھا۔ اس کے فوراً بعد وہ اپنے گاؤں کے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن گئے جس کے بعد پولیس نے انتہائی تیزی اور رازداری سے گاڑی کے مالک کو گرفتار کر کے اس کی نشان دہی پر رحمت کو آزاد کروا لیا تھا۔ اغوا کار اور اس کے دیگر تمام ساتھی گرفتار ہو چکے تھے۔

رحمت کو جب دوبارہ ہوش آیا تو اس کا سر اس کی ماں کی آغوش میں تھا۔ وہ شرمندگی سے اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ n

شیرنی کی دوست

ترجمہ: افشاں بیگم

یہ کوئی پانچ صدی پہلے کی بات ہے، ایک بار اسپینیوں نے بغیر کسی وجہ کے جنوبی امریکا پر دھاوا بول دیا۔ مقامی امریکی قبائل نے بڑی دلیری سے ان کا مقابلہ کیا اور اسپینیوں کے خیموں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسپینیوں کو اپنے علاقے میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ مالڈوناڈو ایک اسپینی لڑکی تھی جس کی عمر اس وقت پندرہ برس کی تھی۔ یہ کہانی اسی لڑکی کے بارے میں ہے۔

Querand قبیلے کے لوگوں نے اس اسپینی بستی کو گھیر لیا جہاں مالڈوناڈو رہتی تھی۔ یہ لوگ پہلے ہی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بھوکے مر رہے تھے۔ دشمن نے ان کی خوراک کی رسد کا راستہ ہی کاٹ دیا تھا۔ انہوں نے اپنے کپتان سے اجازت مانگی کہ وہ اس بستی میں جاکر خوراک تلاش کرنا چاہتے ہیں، مگر سخت مزاج کپتان نے انہیں اجازت نہیں دی۔

اس موقع پر مالڈوناڈو اپنی بستی سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی اور گھنے جنگل کے اندر چلتی چلی گئی۔ رات ہوئی تو اس کے کانوں میں جنگلی جانوروں کی خوف ناک آوازیں آنے لگیں۔ وہ خود سے کہنے لگی: "اس وقت کہاں جاؤں، کوئی محفوظ جگہ بھی تو نہیں ہے، رات کہاں گزاروں گی، کہاں سوؤں گی؟"

یکایک اس کے کانوں میں کسی جانور کی درد بھری آواز سنائی دی جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ مالڈوناڈو کو ایسا لگا جیسے وہ آواز اس کے قریب ہی ہے۔ غور کرنے پر اسے اندھیرے میں ایک غار دکھائی دیا تو اس نے اندازہ لگایا کہ وہ آواز اسی غار سے آرہی ہے۔ وہ جلدی سے غار کے اندر گئی تو دیکھا کہ وہاں فرش پر ایک شیرنی لیٹی ہے جس کے قریب ہی تین نومولود بچے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ مالڈوناڈو کو دیکھتے ہی شیرنی نے غرانے کی کوشش کی، مگر پھر چپ ہوگئی۔ مالڈوناڈو نے پہلا کام یہ کیا کہ شیرنی کے بچوں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھاکر پیار کیا اور پھر غار کے فرش کو صاف کر کے اس پر تھوڑی سی گھاس بچھاکر انہیں وہاں لٹایا۔ اس کے بعد شیرنی کو بھی اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اٹھی اور اس بستر پر جاکر لیٹ گئی جو مالڈوناڈو نے اسی کے لیے تیار کیا تھا۔

شروع کے دنوں میں وہ بچوں کی صفائی ستھرائی میں شیرنی کی مدد کرتی تھی، مگر بعد میں شیرنی اپنی اور بچوں کی خوراک کی تلاش میں باہر جانے لگی، جب کہ مالڈوناڈو اس دوران اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس طرح وہ دونوں مل کر نومولود بچوں کی پرورش کرنے لگیں۔

ایک روز جب مالڈوناڈو باہر کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر رہی تھی اور شیرنی غار میں بچوں کی نگرانی کر رہی تھی کہ نہ جانے کہاں سے Querand جنگجو وہاں آگئے۔ انہوں نے مالڈوناڈو کو پکڑا اور اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے گئے۔ مالڈوناڈو سمجھ چکی تھی کہ اب اسے بدترین موت سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ لیکن Querand جنگجوؤں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ مالڈوناڈو بھی ان لوگوں کے ساتھ گھل مل گئی اور گاؤں کے مختلف کاموں میں ان کی مدد کرنے لگی۔ ایک روز اسپینی لٹیروں نے اس گاؤں پر حملہ کیا تو وہاں انہیں مالڈوناڈو دکھائی دی۔ وہ سے پہچان گئے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بستی سے جنگل میں بھاگ گئی تھی، اس لیے اسپینی کپتان کو اس لڑکی پر بہت غصہ تھا۔ اس نے اعلان کیا: "اس لڑکی کو جنگل میں لے جاکر درخت سے باندھ دو، تاکہ جنگلی جانور اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔"

چناں چہ مالڈوناڈو کو جنگل میں لے جاکر ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا گیا۔ سبھی لوگ اس کے لیے دکھ اور افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ چند روز بعد وہ لوگ ایک بار پھر جنگل میں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں مالڈوناڈو کی بچی کھچی ہڈیاں ہی ہوں گی، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مالڈوناڈو پہلے کی طرح درخت کے تنے سے بندھی ہوئی تھی، وہ نہ صرف زندہ تھی، بلکہ پہلے سے زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک شیرنی نہ صرف اس کے لیے خوراک لاتی تھی بلکہ اس نے مسلسل مالڈوناڈو کی پہرے داری بھی کی تھی۔ n

صبح کا بھولا

طارق گولڈن۔ کراچی

کرائے کے مکان میں رہنے والے وحید کچھ دن سے پریشان تھے جسے ان کے دفتر کا ساتھی جمیل بھانپ گیا۔ جیسے ہی وقت ملا تو جمیل نے ان سے پوچھا: ”وحید بھائی! کیا بات ہے میں آپ کو کچھ دن سے پریشان دیکھ رہا ہوں؟“

وحید نے آہ بھر کر کہا: ”ہاں، تمھیں تو پتا ہے کہ لگی بندھی تنخواہ میں مکان کا کرایہ، بچوں کی فیس، وین کا کرایہ اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنا کتنا مشکل ہے۔ ایسے میں اگر گھر چوری ہو جائے تو پریشان ہونا فطری بات ہے ناں!“

”اچھا، آپ کے گھر میں چوری ہوئی ہے؟“ جمیل بولا۔

”چوری کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن مسلسل دو دن تک چوری ہونا، یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔“ وحید نے کہا۔

”تمھیں کس پر شک ہے؟ چوری کس وقت ہوئی؟ اس وقت تم گھر پر تھے یا آفس میں؟“ جمیل نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”مسلسل دو دن تک! صبح میں فجر کی نماز پڑھنے گیا تو واپسی پر پہلے چار ہزار روپے میرے بٹوے سے غائب ہوئے، دوسری دفعہ بیگم کو تحفے میں دیا ہوا موبائل فون غائب تھا۔“

”اچھا! پھر تو چوری ہونی ہی تھی۔ آج کل چور بھی اسی تاک میں ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا سی بے پروائی کرے اور چور اپنا کام دکھا جائے۔“ جمیل نے لاابالی انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟ میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔“ وحید نے کہا۔

جمیل بولا: ”تم گھر کو باہر سے تالا لگا کر نماز پڑھنے نہیں گئے اور چور کو موقع مل گیا۔“

”تالا لگا کر ہی جاتا ہوں۔ ان دو دنوں میں بھی تالا لگا کر ہی گیا تھا۔“ وحید نے جواب دیا۔

جمیل کچھ سوچتے ہوئے بولا: ”پھر تو چور کو پکڑنا بہت مشکل ہے، بہر حال میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تمہارا چور پکڑا جائے۔“ یہ کہہ کر جمیل آگے بڑھ گیا۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وحید نے ایک روز صبح مسجد جاتے ہوئے اپنے مالک مکان کے نوجوان بیٹے سلمان کو دیکھا جو گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ وحید کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور وحید کے پیچھے پیچھے مسجد چلا آیا۔

جب سلمان مسجد کے واش روم میں گیا تو وحید کو شک ہوا کہ کہیں سلمان ہی وہ چور نہ ہو۔ یہ سوچتے ہوئے وحید وضو خانے کی طرف جانے کے بجائے امام صاحب کے کمرے میں جا کر کھڑکی سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد سلمان واش روم سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھ کر باہر چلا گیا۔ وحید بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے تھے۔ سلمان ان کے گھر کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ وحید بھی پیچھے پہنچ گئے اور کرخت لہجے میں کہا: ”اچھا، تو وہ چور تم ہو! ابھی تمھیں اس حرکت کا مزہ چکھاتا ہوں۔“

”کیا مطلب انکل! میں سمجھا نہیں۔“ سلمان انجان بننے لگا۔

وحید نے کہا: ”تم نے میرے گھر چوری کی! جلدی بتاؤ کہ میرا موبائل فون اور چار ہزار روپے کہاں ہیں؟“

لیکن سلمان کسی طور نہیں مانا تو وحید کہنے لگے: ”تم ایسے نہیں مانو گے، میں ابھی 15 پر فون کر کے پولیس کو بلاتا ہوں۔“

وحید کا یہ کہنا تھا کہ سلمان گھبرا کر رو پڑا: ”پلیز انکل! آپ پولیس کو نہ بلائیں۔ میں دونوں چیزیں آپ کو واپس کر دوں گا۔“

پھر سلمان اندر گھر میں گیا اور موبائل فون اور چار ہزار روپے لا کر وحید کو دیتے ہوئے کہا: ”انکل! یہ لیں پیسے اور موبائل لیکن پلیز میرے ابو کو نہیں بتائیے گا، وہ مجھے بہت ماریں گے۔ اور کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیجیے گا ورنہ ابو کی بہت بدنامی ہو گی۔“

”ٹھیک ہے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، مگر میری ایک شرط ہے۔“ وحید نے کہا۔

”انکل! مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے۔“ سلمان شرمندگی سے بولا۔

”وحید نے کہا: ”میں گھر کو روز تالا لگا کر جاتا ہوں، تم نے تالا کیسے کھولا؟ دوسرے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرو گے۔“

سلمان نے کہا: ”انکل! آپ ہمارے کرایہ دار ہیں اور آپ کے گھر کے دروازے میں لگا ہوا تالا بھی ہمارا ہے۔ اس کی دوسری چابی ہمارے پاس ہے۔ اب آپ نیا تالا لا کر لگا دیں۔ اور میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔“

یہ سن کر وحید نے سلمان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: ”شاباش! اگر صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ n

تمام اعضاء کا روزہ

اسماء انصاری۔ ٹانگو والی

روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک اللہ کی رضا کے لیے کچھ نہ کھانے پینے کا نام ہے۔ لیکن کیا اللہ تعالیٰ کو صرف ہمارا بھوکا پیاسا رہنا ہی مقصود ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ روزہ باطنی عبادت ہے، کیوں کہ جب تک ہم خود کسی پر ظاہر نہ کریں، کسی کو یہ علم نہیں ہو سکتا کہ ہمارا روزہ ہے۔ اگر کسی شرعی عذر کے تحت روزہ نہ بھی رکھا جائے تو روزے کا "پردہ" ضرور کیا جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کے سامنے نہ کچھ کھایا جائے اور نہ پیا جائے۔ روزہ صرف بھوکے پیاسے رہنے کا نام نہیں بلکہ ہر عضو کا روزہ ہو گا تو ہی ہمارا روزہ قبول ہو گا۔

☆ آنکھ کا روزہ:

آنکھ اٹھے تو صرف جائز کام کی طرف، اپنی آنکھ سے کوئی بری چیز نہ دیکھیں۔ اپنی نظروں کی حفاظت کریں۔ آنکھوں کو روشن رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ فلم، ڈرامے، کھیل، تماشے نہ دیکھیں۔

☆ کان کا روزہ:

کان کا روزہ یہ ہے کہ صرف جائز باتیں سنیں جیسے تلاوت، نعت، اذان اور نماز، صرف اچھی باتیں سنیں، ڈھول باجے اور موسیقی سے پرہیز کریں۔ اس کے علاوہ نہ کسی کی چغلی سنیں اور نہ غیبت۔

☆ زبان کا روزہ:

زبان سے صرف جائز اور نیک بات کہی جائے۔ نہ کسی کی غیبت کی جائے اور نہ چغلی کھائی جائے، نہ گالی گلوچ کی جائے اور نہ لڑائی جھگڑا اور نہ ہی کوئی ایسی بات کی جائے جو دوسروں کو دکھ پہنچائے۔ کوشش کریں کہ آپ کی زبان زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔

☆ ہاتھوں کا روزہ:

اپنے ہاتھوں سے کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اپنے ہاتھوں میں کسی نابینا کا ہاتھ لے کر اسے راستہ دکھائیں، آپ کو ایک ایک قدم پر ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ کسی یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریں، ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے ہر بال کے بدلے ایک ایک نیکی ملے گی۔ نہ ظلم کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھائیں اور نہ کسی اور طرح کا ظلم کریں۔

☆ پاؤں کا روزہ:

پاؤں کو نیک کاموں کی طرف جانے کے لیے حرکت دیں۔ مسجد کی طرف قدم اٹھائیں۔ علماء کی مجالس میں جائیں۔ نیک لوگوں کی اچھی اچھی باتیں سنیں۔ اپنے قدموں کو غلط راہ پر نہ چلنے دیں۔ n

تاریخ کا ایک ورق

سمیعہ پرویز۔ اوکاڑہ

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کو تھی اور ان کی جگہ انگریز اس علاقے کے حاکم بننے والے تھے۔ اسی مشکل دور میں ایک جنگل میں کچھ شہزادے آوارہ گردی کر رہے تھے۔ ان میں شہزادہ نصیر الملک بھی شامل تھا۔

وہ چھوٹی چڑیوں اور فاختاؤں کو غلیل سے مار رہے تھے۔ ایک گدڑی پوش فقیر وہاں سے گزرا تو اس نے شہزادوں سے کہا: ”ان بے زبان پرندوں کو کیوں ستا رہے ہو؟ یہ جان دار آپ کی طرح دکھ اور تکلیف کا احساس کرتے ہیں ۔“

شہزادہ نصیر الملک بگڑ کر بولا: ”او دو ٹکے کے آدمی! تو ہمیں نصیحت کرنے والا کون ہے؟ شکار تو سبھی کرتے ہیں۔“

فقیر نے کہا: ”صاحب عالم! شکار ایسے جانور کا کیا جاتا ہے کہ ایک جان جائے تو پانچ دس آدمیوں کا پیٹ بھر جائے۔ ان ننھی چڑیوں کو مارنے سے تمھیں کیا ملے گا؟ بیس ماریں گے تب ایک آدمی کا پیٹ بھرے گا۔“ شہزادہ نصیر الملک فقیر کے اس طرح بولنے پر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے پر مارا تو وہ بے چارہ اوندھے منہ گرا اور تکلیف سے چیخنے لگا: ”ہائے میری ٹانگ توڑ ڈالی۔“

اس کے گرتے ہی تمام شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے۔ فقیر گھسٹتا ہوا جنگل کے سامنے واقع قبرستان کی طرف جانے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا: ”وہ تخت کیسے آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک اور ظالم ہوں۔ تو نے میری ٹانگ توڑی ہے، خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے گا اور تو بھی زمین پر اسی طرح گھسٹے گا۔“

مظلوم کی بددعا دیر سے سہی، مگر اثر ضرور کرتی ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد توپیں گرجنے لگیں، گولے برسنے لگے اور زمین پر لاشوں کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ مغلوں کا دارالحکومت دہلی ویران اور سنسان ہو گیا۔ اب لال قلعے کے وہی شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی میں بھاگے چلے جا رہے تھے اور متعدد گورے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ انھوں نے شہزادوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ سب شہزادے زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ گوروں نے قریب آ کر دیکھا تو تمام شہزادے مر چکے تھے۔ صرف نصیر الملک سانس لے رہا ہے۔ انھوں نے اسے حراست میں لے کر کیمپ میں پہنچا دیا۔ جب ان کے افسر کو معلوم ہوا کہ زخمی شہزادہ، مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھا جائے۔ پھر انگریزوں نے شاہی خاندان کے لوگوں اور عام رعایا پر ظلم کی انتہا کر دی۔ اس دوران ایک رات پہاڑی کیمپ پر مرزا نصیر الملک رسیوں سے بندھا بیٹھا تھا کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑتا ہوا اور اس کی رسیاں کھولتے ہوئے بولا: ”میں نے بڑے افسر سے آپ کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ آپ فوراً بھاگ جائیں۔“

شہزادہ پیدل چلنا کیا جانے؟ وہ پریشان تو بہت ہوا، مگر پھر جنگل کی طرف چل دیا۔ کچھ دور چلا ہو گا کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے، زبان خشک ہو گئی اور نڈھال ایک درخت کے سائے میں گر پڑا۔ اس نے نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”الٰہی! یہ کیسا غضب ہم پر ٹوٹا ہے؟ ہم کہاں جائیں؟“

دہلی کے چاندنی چوک میں انگریز اپنے مجرموں کو پھانسیاں دے رہے تھے۔

کچھ عرصے بعد دہلی کی گلیوں میں چنگیزی نسل کا ایک آدمی دکھائی دیا جو زمین پر گھسٹتا ہوا چلتا تھا۔ اس کے پاؤں فالج کے باعث بے کار ہو گئے، اس کے گلے میں جھولی لٹکی تھی۔ وہ راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتا۔ جنھیں معلوم تھا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کا پوتا ہے تو وہ اس کی جھولی میں کچھ سکے ڈال دیتے۔

بازار میں بچے غلیل سے کھیل رہے تھے۔ شہزادہ گھسٹتا جا رہا تھا کہ ایک بچے نے غلہ غلیل میں رکھ کر شہزادے کے گھٹنے پر مارا تو وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اسے اپنا شہزادگی کا وقت یاد آ گیا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، جیسا کیا تھا، اس کی سزا تو بھگتنی تھی!n

طارق کی محنت رنگ لائی

اشفاق قادر سنگی۔ پنڈ سلطانی

طارق کے والدین بہت غریب اور نادار تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے سخت محنت اور مشقت کر کے اپنے بیٹے طارق کو کسی نہ کسی طرح میٹرک تک پہنچادیا تھا، مگر اپنے حالات کی وجہ سے وہ اسے سرکاری اسکول میں ہی پڑھا سکے۔ طارق چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت بدل سکتا تھا، مگر اس کی قسمت ہی خراب تھی جو وہ اپنی پڑھائی پر توجہ نہ دے سکا اور میٹرک میں فیل ہو گیا۔ سرکاری اسکول کے میٹرک فیل کو آگے کون داخلہ دیتا، چناں چہ دنیا کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن گئیں اور وہ بے حد مایوس ہو گیا۔

طارق کے تمام دوست میٹرک کا امتحان پاس کر کے کم عمری میں ہی کسی نہ کسی سرکاری محکمے میں چپراسی لگ گئے، مگر طارق کو تو چپراسی کی ملازمت بھی نہ مل سکی، کیوں کہ اس کے پاس میٹرک کی سند تک نہیں تھی۔

ایک سال تک دربدر کی ٹھوکریں کھا کر طارق نے دل میں پکا عہد کیا کہ اب وہ ایک بار پھر میٹرک کا امتحان دینے کی کوشش کرے گا، ممکن ہے اس بار اسے کامیابی مل جائے۔

طارق کے گاؤں میں سر منظور بھی رہتے تھے جو بہت خدا ترس اور نیک انسان تھے۔ ان کا اپنا ایک پرائیویٹ اسکول تھا جس کی فیس تو زیادہ تھی، مگر سر منظور غریب بچوں کو اپنے اسکول میں مفت پڑھاتے تھے۔ جب طارق نے سر منظور کو اپنے تمام حالات بتائے تو انہوں نے طارق کو اپنے اسکول میں چوکیدار کی نوکری بھی دے دی اور ساتھ ساتھ اس کو اپنے اسکول میں تعلیم بھی دینے لگے۔ طارق نے دل لگا کر محنت کرنا شروع کر دی، اس کے والدین بھی خوش تھے، کیوں کہ اب وہ پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا اور اپنا مستقبل سنوارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سر منظور طارق کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے اور اس کو بروقت تنخواہ بھی دیتے تھے۔ طارق بھی دل لگا کر پڑھتا رہا اور ساتھ ساتھ چوکیدار کی نوکری بھی کرتا رہا۔

پھر میٹرک کے سالانہ امتحانات کا وقت آیا تو طارق نے بڑی محنت سے تمام پیپر دیے اور اس بار اللہ رب العزت نے بھی اس پر کرم فرمایا۔ وہ سالانہ امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا جس کے بعد اسے ایک سرکاری محکمے میں ہی ملازمت مل گئی، مگر چوں کہ وہ صرف میٹرک پاس تھا، اس لیے اسے معمولی نوکری ملی۔ مگر طارق اب بھی پڑھتا رہا، اس کا ارادہ تھا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کر کے بہتر ملازمت حاصل کر لے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ n

ٹیچر کی نصیحت

محمد منیب خان۔ کراچی

سلمان نے حیدر کو ناخن کترتے ہوئے دیکھا تو اس سے دوستانہ انداز میں کہا: ”اس طرح دانت سے ناخن کاٹنے سے کئی بیماریاں لگنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ اچھی عادت نہیں ہے۔“

سلمان کی پیاری نصیحت سن کر حیدر اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں بولا: ”کل تم ہاتھ دھوئے بغیر برگر کھا رہے تھے اور آج مجھے دادا جان کی طرح نصیحتیں کر رہے ہو!“

کلاس ٹیچر نے جب سلمان اور حیدر کو اس طرح باتیں کرتے دیکھا تو دونوں کو اپنے پاس بلا کر ماجرا پوچھا۔ اس پر سلمان نے انہیں پوری بات بتادی۔ یہ سن کر ٹیچر نے ان دونوں کو بڑے محبت بھرے لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے کہا: ”بیٹا! کبھی یہ مت دیکھو کہ کون بات کر رہا ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔“

ان دونوں نے اپنے ٹیچر کی اس نصیحت کو غور سے سنا اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

چھٹی کے بعد جب حیدر گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا بڑا بھائی غصے میں بجلی والوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حیدر کو ٹیچر کی نصیحت یاد آگئی جو انھوں نے صبح ہی کی تھی۔ چناں چہ حیدر نے یہ سوچے بغیر کہ اس وقت اس کے سامنے اس کا بڑا بھائی ہے، اسے کھری کھری سنانی شروع کر دیں۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کہہ رہا تھا: ”آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کی پیٹھ پیچھے اسے برا بھلا کہیں۔“

جب حیدر کے بڑے بھائی نے اسے بد تمیزی سے بات کرتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آکر اسے دو تھپڑ لگا دیے۔ یہ شور سن کر امی کمرے میں آگئیں۔ جب ان کو یہ پتا چلا کہ حیدر بد تمیزی کر رہا تھا تو امی نے بھی اسے ڈانٹ پلا دی۔

دوسری طرف سلمان شام کے وقت کھیل کے میدان کی طرف جا رہا تھا تو اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے بچو ایک ملنگ کو دیکھا جو کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سلمان نے قریب جا کر سنا تو وہ کہہ رہا تھا: ”فضول خرچی سے ورنہ تمہارا انجام میری طرح ہوگا۔“

سلمان نے اس کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا اور اس نے اسی وقت دل میں یہ عہد کر لیا: ”اب میں ہمیشہ فضول خرچی سے پرہیز کروں گا۔“

سلمان اور حیدر اگلے دن اسکول پہنچے تو دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے واقعات سنائے۔ انہوں نے اپنے ٹیچر کی نصیحت پر عمل کیا تھا۔ حیدر کی کہانی سن کر سلمان اس پر ہنس رہا تھا کہ ٹیچر کلاس میں داخل ہوئے۔ انہوں نے جب سلمان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی جس پر سلمان نے کل کی پوری کہانی انہیں سنادی

۔

اس پر ٹیچر مسکرائے اور بڑے تحمل سے کہا: ”دیکھو بچو! ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک منفی اور دوسرا مثبت، سلمان نے مثبت پہلو پر عمل کیا تو اسے فائدہ پہنچا، جب کہ حیدر نے منفی پہلو پر عمل کیا تو اسے نقصان اٹھانا پڑا۔ ہمیں چاہیے کہ ہر معاملے میں ہمیشہ مثبت پہلو کو سامنے رکھیں اور کبھی منفی انداز سے نہ سوچیں، کیوں کہ اس سے نقصان ہوتا ہے۔“ n

محمد علیم نظامی...... لاہور

تین شہزادے

ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ دونوں بڑے شہزادے بے حد وجیہہ اور دراز قد تھے، البتہ سب سے چھوٹا شہزادہ پست قد اور معمولی شکل و صورت کا مگر عقلمند تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنے معمولی شکل و صورت والے فرزند کو نفرت و حقارت سے دیکھ رہا تھا کہ شہزادہ اپنی خداداد فراست سے باپ کے رویئے کا سبب سمجھ گیا۔ اس نے کہا: "بابا جان! چھوٹے قد والا عقلمند، بلند قامت احمق سے بہتر ہے۔ جو چیز قد و قامت میں چھوٹی ہے ضروری نہیں وہ حقیر اور معمولی بھی ہو، ہو سکتا ہے وہ قیمت میں زیادہ اور کارآمد ہو۔ کسی بھی انسان کی اچھائی کا دارومدار اس کی خوبصورتی اور سرو قامتی پر منحصر نہیں، جیسا کہ بکری حلال ہے اور ہاتھی حرام ہے اور وہ قول تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ حسن نہیں عقل و ذہانت اصل خزانہ ہے، کیونکہ حسن والے اکثر عقل والوں کے غلام ہوا کرتے ہیں۔" چھوٹے شہزادے کی گفتگو سن کر بادشاہ ہنس پڑا اور اپنے بیٹے کی فہم و فراست سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے تینوں بیٹوں میں خوبصورتی کی بناء پر کوئی فرق نہیں کرے گا۔ سلطنت کے امراء و وزراء بھی آہستہ آہستہ چھوٹے شہزادے کی ذہانت کے قائل ہو گئے......

اور ہر طرف یہ خیال عام ہو گیا کہ بادشاہ کا ولی عہد بننے کا اعزاز بڑے شہزادوں کو نہیں بلکہ چھوٹے شہزادے کو ملے گا۔ اب یوں تو عوام اور بادشاہ، چھوٹے شہزادے کو ملنے والی عوامی مقبولیت پر خوش تھے مگر اس کے بھائی اس بات پر بہت رنجیدہ ہوتے، اور ہر وقت یہی سوچتے کہ آخر کس طرح چھوٹے شہزادے کو سب کے سامنے رسوا کیا جائے۔ وقت یونہی گزرتا رہا کہ اچانک ایک طاقتور دشمن نے بادشاہ کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور لڑائی کے لئے پر تولنے لگے تو سب سے پہلا شخص جو میدان میں آیا، وہ وہی پست قد شہزادہ تھا۔ یہ شہزادہ دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس کے کئی بہادروں کو مار گرایا۔ ایسے میں بادشاہ میدان جنگ میں اپنے بیٹے کی بہادری اور شجاعت سے متاثر نہ ہوتا یہ کیسے ممکن تھا۔

"کسی نے سچ کہا ہے کہ جب تک کسی کے ہنر کو اچھی طرح سے نہ دیکھ لو اسے حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دبلا پتلا سبک رفتار گھوڑا لڑائی کے دن کام آتا ہے، موٹا تازہ خوبصورت بیل نہیں......" کہتے ہیں کہ دشمن کی فوج بہت زیادہ تھی، اس کے مقابلے میں بادشاہ کی فوج کم تھی۔ ایک گروہ اپنی کم تعداد دیکھ کر ہی چھوڑ بیٹھا اور اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ بہادر شہزادہ ان کے تیور بھانپ گیا اور پھر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ شجاعت و بہادری میں ہی یکتا نہیں ہے بلکہ اس کی پر جوش تقریر مردہ دلوں میں امید پیدا کرنے کی بھی اہل ہے۔ اس نے للکار کر کہا: "میرے بہادر ساتھیو! ہمت سے کام لو، یہ جنگ خدا کی آزمائش ہے اور ہم اپنے حوصلے سے اس امتحان میں کامیابی حاصل کر کے رہیں گے۔ اگر آج تم یہاں اپنے ساتھیوں کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تو شاید تمہاری زندگی بچ جائے گی، مگر اس بزدلانہ حرکت پر خود کو بھی معاف نہ کر سکو گے۔ آؤ آج اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں تاکہ کل خدا اور ضمیر کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جائیں۔"

شہزادے کے جوش دلانے پر سپاہیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے مرنے مارنے کا تہیہ کر کے دشمن پر زوردار حملہ کیا۔ دونوں بڑے شہزادے جو اس جنگ میں بے دلی سے شامل تھے وہ بھی آج اپنے بھائی کی بہادری کے معترف نظر آ رہے تھے۔ آخر کار ان کا خون بھی جوش مارنے لگا اور وہ بھی اپنے چھوٹے سپہ سالار بھائی کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ دشمن اس ہولناک یلغار کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح کے بعد بادشاہ نے فرط مسرت سے تینوں شہزادوں کو گلے سے لگایا، اور اپنے بیٹوں کی بہادری اور اتحاد کی تعریف کی اور پھر سب نے سلطنت کی ترقی کے لئے مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

سچ کہتے ہیں اتحاد، بہادری اور محبت و رواداری کا بے لوث جذبہ ہی دنیا میں ہر انسان کی اصل کامیابی کا ذریعہ ہے۔ صرف خوبصورتی کی بنیاد پر کسی کو قابل تعریف ٹھہرانا کسی طور عقلمندی نہیں۔



تم کون ہو؟

علی شان طارق۔ اسلام نگر

عادل اور عاصم اچھے دوست تھے۔ ان کے گاؤں کے قریب ایک بڑا جنگل واقع تھا جس میں بہت سے لوگ شکار کھیلنے آتے تھے۔ ایک دن عاصم اور عادل بھی اس جنگل میں گئے اور کھیلتے کھیلتے بھٹک کر واپسی کا راستہ بھول گئے۔ اسی دوران جنگل کے اندر انھیں ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ گھنے جنگل میں جھونپڑی دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھی اور وہ تیزی سے جھونپڑی کے قریب پہنچے اور وہاں آواز دی جسے سن کر اندر سے ایک بزرگ نکلے اور انہیں دیکھنے لگے۔

عاصم نے بزرگ سے پوچھا: "یہ راستہ کہاں جائے گا؟"

بزرگ نے کہا: "یہ راستہ یہیں رہے گا، مگر اس پر چلنے والا جنگل میں ہی گھومتا رہے گا، لیکن تم کون ہو؟"

"ہم تو مسافر ہیں۔" عادل نے کہا۔

"مسافر تو دو ہی ہوتے ہیں: ایک سورج دوسرا چاند، تم کون ہو؟" بابا نے پھر کہا۔

"بابا! ہم تو مہمان ہیں۔" عاصم نے جواب دیا۔

"مہمان تو دو ہی ہیں: ایک جوانی اور دوسری دولت، مگر تم کون ہو؟" بزرگ نے پھر ایک سوال داغ دیا۔ اس بار دونوں ہی بزرگ کا سوال سن کر حیران زدہ ہو گئے، کچھ دیر چپ رہنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ کہا: "ہم ایک دوسرے کے کام آنے والے ہیں۔"

یہ سن کر بزرگ نے کہا: "دوسروں کے کام آنے والے تو دو ہی ہیں: ایک عورت اور دوسری زمین، تم کیسے ایک دوسرے کے کام آسکتے ہو؟ تم کون ہو؟" اس بار بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا جس کے جواب میں عاصم بولا: "باباجی! ہم پردیسی ہیں۔"

یہ سن کر بزرگ کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا اور وہ بولے: "پردیسی تو دو ہی ہوتے ہیں: ایک جان اور دوسرے درختوں کے پتے، تم کون ہو؟"

وہ دونوں بزرگ کی باتیں سن کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اس کے بعد ان بزرگ اور عاصم و عادل کے درمیان بہت سوال و جواب ہوئے، مگر آخر کار دونوں دوستوں نے ہار مان لی اور کہا: "ہم اس جنگل میں شکار کھیلنے آئے تھے اور راستہ بھٹک گئے تھے۔"

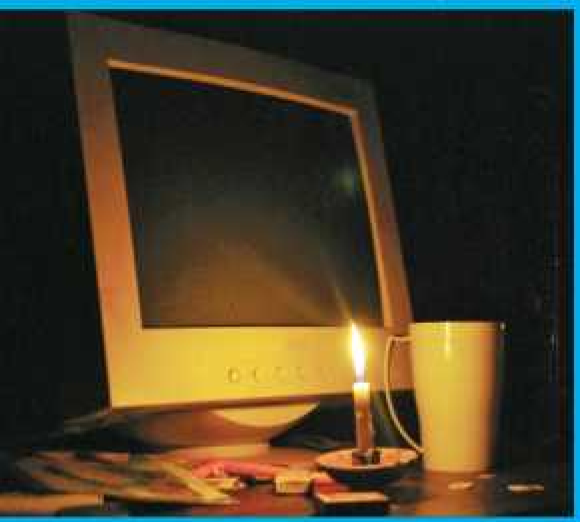
یہ سن کر بزرگ بہت خوش ہوئے اور ان دونوں کو گاؤں جانے کا راستہ بتایا اور ان کی خوب خاطر مدارات بھی کی۔ ■

اُف! بجلی کب آئے گی؟

عائشہ رانا ...... کراچی

لوڈ شیڈنگ! اوہو لوڈ شیڈنگ! نجانے بجلی کب آئے گی! یہ الفاظ تو آج کل ہر کسی کی زبان پر ہیں۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ شاید اس مسئلے کو حل کرنا محال ہے، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہمیں کب لوڈ شیڈنگ سے چھٹکارا ملے گا۔ ایک دن، اسکول میں صبح نو بجے بجلی چلی گئی۔ ہمیں لگا شاید آدھے یا ایک گھنٹے میں آجائے گی۔ گیارہ سے بارہ بج گئے لیکن بجلی نہ آئی۔ کلاس میں گرمی سے برا حال تھا۔ ہر بچہ نڈھال تھا۔ کوئی سو رہا تھا، کوئی بجلی واپس آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پڑھائی بھی نہیں ہورہی تھی، کیونکہ لائٹ نہ ہونے کی صورت میں گرمی سے برا حال تھا ہی، اوپر سے کلاس میں اندھیرا بھی چھا گیا تھا۔ اللہ اللہ کرکے ڈیڑھ بجا اور چھٹی کی گھنٹی بجی۔ سب بچے بے زاری سے اسکول سے باہر نکلے اور بڑی مشکل سے اسکول کا بھاری بستہ اٹھا کر گھر پہنچے۔ میں گھر پہنچی تو وہاں بھی وہی عالم تھا۔ سب کے چہروں پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ خیر نہا دھو کر میں نے کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن گرمی نے سونے نہ دیا۔ تھک ہار کر چھت پر گئی کہ شاید وہاں ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ چھت پر پہنچی تو دیکھا کہ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تیز کڑکتی دھوپ نے تو جان ہی نکال دی۔ میں بھاگ کر نیچے آگئی کیونکہ اس گرمی کو برداشت کرنا کسی پہاڑ جیسا لگ رہا تھا۔ اب تین بج رہے تھے جنریٹر وغیرہ بھی چل چل کر بے کار پڑ گئے تھے۔ جیسے تیسے چار بجے۔ امی کو کہہ کر میں نے تائی امی اور میری کزنز کو گھر پر بلوالیا کہ شاید باتیں کرتے ہوئے وقت گزر جائے۔ سب گھر پر آئے تو میں نے بتایا کہ صبح نو بجے سے لائٹ گئی ہے اور اب تک آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ انہوں نے بھی کہا کہ اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ہمارے علاقے میں بھی ایک ہفتہ پہلے ایسا ہی ہوا تھا۔ باتیں کر کر کے تھک گئے۔ اب چھ بج گئے، ہم لوگ ہوا کے ایک جھونکے کو بھی ترس رہے تھے۔ اب رات کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا، سب کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ کسی طرح موم بتی کی روشنی میں کھانا پکایا اور کھایا گیا۔ گھر میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ہم بستر پر بیٹھے ہوئے تھے، اچانک کمرے کی لائٹ اور پنکھا چلا۔ سب کی خوشی سے چیخیں نکل گئیں۔ بارہ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے بعد اب بجلی آئی تھی، اس وقت ہمیں وہ پنکھے کی ہوا بھی جنت کی ہوا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ سب نے شکرانے کے نوافل پڑھے۔

اس پورے عرصے میں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلا کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں نجانے کتنی بجلی ضائع کرتے ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ بجلی کی بچت کرنی چاہیے۔ اس سے فائدہ بھی ہمیں ہی ہوگا اور وہ یہ کہ بجلی کا بل کافی کم ہوجائے گا لہذا جتنی ضرورت ہو اتنی بجلی استعمال کریں۔



اُجڑی ہوئی بستی

طارق گولڈن۔ کراچی

دو سوداگر اپنا سامان تجارت لے کر کسی ملک جا رہے تھے کہ ان کا گزر ایک ایسی بستی سے ہوا جو بالکل اجڑ چکی تھی۔ اس میں ہو کا عالم تھا۔ ایک آدھ مکان اور اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف سوکھے درخت، خالی گھر، ویرانی اور وحشت تھی۔ دونوں دوست اپنے گھوڑے روک کر سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اس بستی کے متعلق باتیں کرنے لگے:

ایک سوداگر نے کہا: ”بستیاں یوں ہی نہیں اجڑتیں، بلکہ ان کے باسیوں کی وجہ سے ہی تباہ ہوتی ہیں۔ کسی بستی کے لوگ اگر اپنے علاقے کی دیکھ بھال نہیں کریں گے تو وہ بستی تباہ و برباد ہو ہی جائے گی۔“

اپنے دوست کی بات سن کر دوسرے سوداگر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسی دوران ایک ادھیڑ عمر اور کمزور سا بوڑھا بھی ان کے قریب آ گیا۔ وہ اپنی بستی کے بارے میں ان دونوں سوداگروں کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ بھی بستی کے بارے میں ان دونوں کو بہت کچھ بتانے لگا۔ دونوں دونوں دوست بوڑھے کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے وہ آگے سفر کے ارادے سے اٹھے تو بوڑھا بولا: ”تم دونوں جا سکتے ہو، لیکن میرا یہ تمام سامان تجارت اور یہ گھوڑے مجھے دے دو۔“

بوڑھے کی بات سن کر سوداگروں کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ لاکھ وہ اس سامان تجارت کی ملکیت کا دعویٰ کرتے رہے، لیکن بوڑھا بہ ضد تھا کہ یہ تمام سامان اور گھوڑے اس کے ہیں۔ اس اجنبی بستی میں ان کا نہ کوئی اپنا تھا اور نہ کوئی ہمدرد، دونوں سوداگر دوست انتہائی پریشان تھے، لیکن وہ اپنا سامان تجارت اور گھوڑے کسی صورت بوڑھے کو دینے پر تیار نہیں تھے۔

اچانک وہ بوڑھا بولا: ”وہ سامنے اس بستی کی عدالت ہے جہاں کا اکلوتا جج اس وقت بھی بیٹھا ہوا ہے، چلو اس سے فیصلہ کرواتے ہیں۔“

دونوں دوست اس بات پر راضی ہو گئے، کیوں کہ وہ سوچ رہے تھے کہ ہمارے پاس تمام ثبوت ہیں، اس لیے فیصلہ بھی ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ دونوں سوداگر اور وہ بوڑھا جج کے سامنے پیش ہو گئے۔ سوداگروں نے تمام واقعہ جج صاحب کے سامنے رکھا اور اپنے مال تجارت کے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا۔ دوسری طرف وہ بوڑھا کوئی بھی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ اب دونوں سوداگر مطمئن تھے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہی ہوگا، لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جج نے مال تجارت اور گھوڑوں کے حوالے سے اپنا فیصلہ بوڑھے کے حق میں دے دیا۔

دونوں سوداگر دوست غم سے نڈھال واپس خالی ہاتھ چل دیے کہ اس غیر بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی طرف داری کرتا۔ وہ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ ہم یہاں رکے ہی کیوں۔

اچانک پیچھے سے اس بوڑھے کی آواز نے ان کے قدم روک دیے۔ وہ پلٹے تو دیکھا کہ بوڑھا تمام سامان تجارت اور گھوڑوں سمیت ان کی طرف آ رہا ہے۔

قریب پہنچ کر بوڑھا بولا: ”تم جاننا چاہتے تھے ناں کہ بستیاں کیسے اجڑتی ہیں تو سنو۔ جب کسی بھی ملک، قبیلے یا بستی سے انصاف اٹھ جائے، ناانصافیاں عام ہو جائیں تو اس ملک، قبیلے یا بستی کو اجڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم نے دیکھ لیا کہ تم حق پر تھے، تمہارے پاس تمام ثبوت بھی تھے، مگر پھر بھی تم ناکام ہو گئے جبکہ میں اس مال پر کوئی بھی ثبوت نہیں دے سکا، لیکن جج نے صرف اس وجہ سے میرے حق میں فیصلہ دیا کہ میں ان کی بستی کا رہائشی ہوں اور اس مال میں سے آدھا اس جج کو بھی مل جائے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں سے انصاف اٹھ جائے تو اس ملک، قبیلے یا بستی کے اجڑنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔“ یہ کہہ کر اس بوڑھے نے تمام سامان تجارت اور گھوڑے ان سوداگروں کے حوالے کیے اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک ویران مکان کی جانب چل دیا۔ n

23 مارچ: یوم پاکستان

مریم کنول۔ کراچی

23 مارچ 1940 کو لاہور کے منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تین روزہ سالانہ اجلاس کے اختتام پر وہ تاریخی قرارداد منظور کی گئی جس کی بنیاد پر مسلم لیگ نے برصغیر میں مسلمانوں کے جداوطن کے حصول کے لیے تحریک شروع کی اور سات برس کے بعد اپنا مطالبہ منظور کرانے میں کامیاب رہی۔ برصغیر میں برطانوی راج کی طرف سے اقتدار عوام کو سونپنے کے عمل کے پہلے مرحلے میں 1937ء میں جو عام انتخابات ہوئے،ان میں آل انڈیا مسلم لیگ کو شکست ہوئی اور کا دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ سخت مایوس ہو گئے۔

لیکن پنجاب میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اور بنگال میں مولوی فضل الحق کی پرجا کرشک پارٹی کو فتح حاصل ملی۔

اس دوران کانگریس نے اقدامات کیے جن سے مسلمانوں کے دلوں میں خطرات نے جنم لیا۔اس صورت میں مسلم لیگ کی اقتدار سے محرومی کے ساتھ اس کی قیادت میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلم لیگ اقتدار سے اس بنا پر محروم کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کہتی ہے۔ بس یہیں سے مسلم لیگ کی قیادت میں دو الگ قوموں کا احساس پیدا ہوا،اسی دوران کانگریس اقتدار سے الگ ہو گئی تو مسلم لیگ کے لیے کچھ دروازے کھلے اور اسی پس منظر میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ 3 روزہ اجلاس 22 مارچ کو شروع ہوا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا، جس میں انہوں نے پہلی بار کہا کہ ہندوستان میں مسئلہ فرقہ ورانہ نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی ہے یعنی یہ دو قوموں کا مسئلہ ہے۔انہوں نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق اتنا بڑا ہے کہ ایک مرکزی حکومت کے تحت ان کا اتحاد خطرناک ہوگا۔انہوں نے کہا کہ اس صورت میں ایک ہی راہ ہے کہ ان کی علیحدہ مملکتیں ہوں۔دوسرے دن انہی خطوط پر 23 مارچ کو اس زمانے کے بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے قرارداد لاہور پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ اس وقت تک کوئی آئینی پلان نہ تو قابل عمل ہوگا اور نہ مسلمانوں کو قبول ہوگا جب تک ایک دوسرے سے ملے ہوئے جغرافیائی یونٹوں کی جداگانہ علاقوں میں حد بندی نہ ہو۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے (ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے) انہیں ملا کر آزاد مملکتیں قائم کی جائیں جن میں شامل یونٹوں کو خود مختاری اور حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔

مولوی فضل الحق کی طرف سے پیش کردہ اس قرارداد کی تائید یوپی کے مسلم لیگی راہ نما چوہدری خلیق الزماں، پنجاب سے مولانا ظفر علی خان، سرحد سے سردار اورنگ زیب، سندھ سے سر عبداللہ ہارون اور بلوچستان سے قاضی عیسیٰ نے کی۔ قرارداد 23 مارچ کو اختتامی اجلاس میں منظور کی گئی۔ پہلی بار پاکستان کے مطالبے کے لیے علاقوں کی نشان دہی بھی کی گئی۔ شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان۔اس میں مملکتوں کا لفظ ایک مملکت سے تبدیل کر دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں 1946ء کے انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو شان دار کامیابی حاصل ہوئی۔ ہندوستان بھر کی 30 کی 30 مسلم نشستیں لیگ نے حاصل کر لیں اور یوں 14 اگست 1947ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔n

زہریلی روٹی

مرزا ظفر بیگ

کسی گاؤں میں شیلا نام کی عورت روزانہ اپنے گھر والوں کے لیے روٹی پکاتی تو ایک روٹی زیادہ پکاتی تھی جسے وہ کسی بھوکے مسافر یا ضرورت مند کو دے دیتی تھی۔ اس کے گھر کے سامنے سے روزانہ ایک کبڑا فقیر گزرتا تھا جو وہ فالتو روٹی لے جاتا تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ روزانہ شیلا کا شکریہ ادا کرنے یا اسے دعائیں دینے کے بجائے دھیمے لہجے میں یہ الفاظ بڑبڑاتا تھا:

"کسی کے ساتھ بُرائی کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ رہے گی، اچھائی کرو گے تو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔"

یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کبڑا فقیر روزانہ شیلا سے روٹی لے جاتا اور یہ الفاظ بڑبڑاتا: "کسی کے ساتھ بُرائی کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ رہے گی، اچھائی کرو گے تو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔"

روزانہ اس فقیر کی یہ بات سنتے سنتے ایک روز شیلا کو غصہ آ گیا۔

وہ خود سے کہنے لگی: "احسان فراموش کہیں کا، کبھی میرا شکریہ ادا نہیں کرتا، الٹی بکواس کرتا ہے۔"

آخر ایک دن شیلا نے کبڑے فقیر سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے فقیر کے لیے جو روٹی پکائی، اس میں زہر ملا دیا۔ زہریلی روٹی تو اس نے پکالی، مگر اب وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس کا دل اسے یہ کام کرنے سے منع کر رہا تھا، چناں چہ شیلا نے وہ روٹی چولھے میں ڈال دی اور کبڑے فقیر کے لیے دوسری روٹی پکانے کے بعد اس کا انتظار کرنے لگی۔ اپنے وقت پر کبڑا فقیر آیا، اس نے شیلا سے روٹی لی اور وہی الفاظ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا:

"کسی کے ساتھ بُرائی کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ رہے گی، اچھائی کرو گے تو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔"

کبڑا فقیر روٹی لے کر چلا گیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ شیلا نے اس کے ساتھ کیا کرنے کی کوشش کی تھی اور اب اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

شیلا حسب معمول روزانہ کبڑے فقیر کے لیے روٹی پکاتی اور اس کے بعد اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا کرتی تھی جو روزی کمانے اور اپنے گھر میں خوش حالی لانے کے لیے کسی دور کے دیس گیا ہوا تھا۔ کئی مہینوں سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ شیلا اس کے لیے بہت پریشان تھی اور دن رات خدا سے اس کی سلامتی کے ساتھ واپسی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

اسی شام کو اس کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تو شیلا نے جلدی سے دروازہ کھولا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، کیوں کہ شیلا کا بیٹا دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ بہت کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر صرف چیتھڑے تھے۔ وہ بہت بھوکا لگ رہا تھا۔

اپنی ماں کو سامنے دیکھ کر بیٹا کمزور آواز میں بولا: "ماں، یہ معجزہ ہی ہے کہ میں زندہ سلامت یہاں تک آ گیا ہوں۔ یہاں آتے ہوئے میں راستے میں کئی جگہ بے ہوش ہوا۔ میں بھوک سے مر ہی جاتا، اگر مجھے وہ کبڑا فقیر نہ ملا ہوتا۔ میں نے اس سے کھانے کو روٹی مانگی تو اس نیک دل انسان نے اپنی پوری روٹی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ روٹی میں روز کھاتا ہوں، مگر آج یہ میں تمہیں دے رہا ہوں، کیوں کہ آج مجھ سے زیادہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔"

اپنے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر شیلا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ گرنے والی تھی کہ اس نے دروازہ پکڑ لیا۔ اسے وہ زہریلی روٹی یاد آ گئی جو اس نے کبڑے فقیر کے لیے پکائی تھی۔ اگر وہ روٹی شیلا نے چولھے میں جلا کر راکھ نہ کر دی ہوتی تو وہی روٹی اس کا بیٹا کھا لیتا اور پھر............ اس سے آگے شیلا کچھ نہ سوچ سکی اور خوف سے لرزنے لگی۔

آج اس کی سمجھ میں کبڑے فقیر کی اس بات کا مطلب آ گیا جو وہ روز روٹی لیتے ہوئے شیلا سے کہتا تھا:

"کسی کے ساتھ بُرائی کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ رہے گی، اچھائی کرو گے تو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔"

یعنی نیکی اور اچھائی کے کاموں کا بدلہ ضرور ملتا ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہمیشہ نیکی کے کام کریں چاہے ہمیں ان کا بدلہ اسی وقت نہ ملے۔ نیکی ایسا عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اس کا اجر بھی ہمیشہ ملتا ہے، اس لیے نیکی کا کام کرنے سے کبھی نہیں رکنا چاہیے۔ n

ضد نہیں کرنا

شاہ بہرام انصاری۔ ملتان

”مما! مجھے آئس کریم لے کر دیں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔“ ننھی عائشہ اپنی امی سے بار بار آئس کریم کھانے کی فرمائش کر رہی تھی۔

”بیٹا! میں نے آپ سے کہا نا کہ بچے سردیوں میں آئس کریم نہیں کھاتے، بیمار ہو جاؤ گی۔“ اس کی امی اسے کئی بار سمجھا چکی تھیں، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دراصل آج دوپہر کو اسکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس آتے ہوئے عائشہ نے اپنی بس سے آئس کریم والے کو دیکھا تھا۔ آئس کریم اسے بہت پسند تھی تبھی اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے آئس کریم کی قیمت پوچھی تو پندرہ روپے بتائی گئی۔ عائشہ نے اپنی جیب ٹٹولی تو اس کے پاس صرف نو روپے تھے۔ اسے بہت غصہ آیا کہ مما اسے اتنے کم پیسے کیوں دیتی ہیں حالاں کہ وہ ان سے روزانہ پچاس روپے لیتی تھی۔ چناں چہ گھر آتے ہی اس نے مما سے آئس کریم کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ مما نے اسے بہت سمجھایا کہ سردیوں میں آئس کریم نہیں کھاتے، مگر وہ ضد کرتی رہی تو مما نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ابو شام کو آفس سے واپسی پر آئس کریم لے آئیں گے۔ مگر رات کو اس کے بابا کا فون آیا کہ وہ کسی ضروری کام سے جا رہے ہیں، اس لیے آج رات گھر نہیں آ سکیں گے۔ عائشہ کو یہ پتا چلا تو اس نے دوبارہ ضد شروع کر دی۔ آخر مما نے اپنے ملازم فضلو سے آئس کریم منگائی۔ عائشہ نے مزے سے آئس کریم کھائی اور سو گئی۔ صبح اٹھی تو اس کے گلے میں درد تھا۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ پھر تیز بخار بھی ہو گیا جس کی وجہ سے وہ اسکول بھی نہ جا سکی۔ تھوڑی دیر بعد پاپا گھر آئے تو مما نے انھیں ساری بات بتائی۔ وہ عائشہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے جس نے بتایا کہ آئس کریم کھانے سے اس کا گلا بیٹھ گیا، شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔

عائشہ نے گھر آ کر امی سے اپنی ہٹ دھرمی کی معافی مانگی اور کہا: ”آئندہ میں کبھی آئس کریم کھانے کی ضد نہیں کروں گی۔“ مما نے اسے معاف کر دیا۔

کرنیں ساتھیو! سردی میں آئس کریم اور ٹھنڈی چیزیں کھانے سے پرہیز کیجیے، اگر خدانخواستہ بیمار پڑ گئے تو کڑوی دوائیں بھی کھانی پڑیں گی اور پڑھائی کا بھی حرج ہو گا۔n